اَلْمُمْتَحِنَة Al-Mumtahinah

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

In the name of Allah, Most Gracious, Most Merciful

Name

In verse 10 of this Surah, it has been enjoined that the women who emigrate to daral-Islam (the Islamic State) and claim to be Muslims, should be examined, hence the title *Al-Mumtahinah*. The word is pronounced both as *mumtahinah* and as *mumtahanah*. The meaning according to the first pronunciation being "the Surah which examines" and according to the second, "the woman who is examined."

Period of Revelation

The Surah deals with two incidents, the time of the occurrence of which is well known historically. The first

relates to Hatib bin Abz Baltaa, who, a little before the conquest of Makkah, had sent a secret letter to the Quraish chiefs informing them of the Prophet's intention to attack them. The second relates to the Muslim women, who had started emigrating from Makkah to Al-Madinah, after the conclusion of the truce of Hudaibiyah, and the problem arose whether they were also to be returned to the disbelievers, like the Muslim men, according to the conditions of the truce. The mention of these two things absolutely determines that this Surah was revealed during the interval between the truce of Hudaibiyah and the conquest of Makkah. Besides, there is also a third thing that has been mentioned at the end of the Surah to the effect; What should the Prophet (peace be upon him) make the women to pledge when they come to take the oath of allegiance before him as believers? About this part also the guess is that this too was revealed some time before the conquest of Makkah, for after this conquest a large number of the Quraish women, like their men, were going to enter Islam simultaneously and had to be administered the oath of allegiance collectively.

Theme and Topics

This Surah has three parts;

The first part consists of verses 1-9, and the concluding verse 13 also relates to it. In this strong exception has been taken to the act of Hatib bin Abi Baltaa in that he had tried to inform the enemy of a very important war secret of the Prophet (peace be upon him) only for the sake of safe guarding his family. This would have caused great

bloodshed at the conquest of Makkah had it not been made ineffective in time. It would have cost the Muslims many precious lives; many of the Quraish would have been killed, who were to render great services to Islam afterward; the gains which were to accrue from conquering Makkah peacefully would have been lost, and all these serious losses would have resulted only because one of the Muslims had wanted to safeguard his family from the dangers of war. Administering a severe warning at this blunder, Allah has taught the believers the lesson that no believer should, under any circumstances and for any motive, have relations of love and friendship with the disbelievers, who are actively hostile to Islam, and a believer should refrain from everything which might be helpful to them in the conflict between Islam and disbelief. However, there is no harm in dealing kindly and justly with those disbelievers who may not be practically engaged in hostile activities against Islam and persecution of the Muslims.

The second part consists of verses 10-11. In this a social problem has been settled, which was agitating the minds at that time. There were many Muslim women in Makkah, whose husbands were pagans, but they were emigrating and reaching Al-Madinah somehow. Likewise, there were many Muslim men in Al-Madinah, whose wives were pagans and had been left behind in Makkah. The question arose whether the marriage bond between them continued to be valid or not. Allah settled this problem forever, saying that the pagan husband is not lawful for the Muslim women, nor the pagan wife lawful for the Muslim husband.

This decision leads to very important legal consequences, which we shall explain in our notes below.

The third section consists of verse 12, in which the Prophet (peace be upon him) has been instructed to ask the women who accept Islam to pledge that they would refrain from the major evils that were prevalent among the womenfolk of the pre-Islamic Arab society, and to promise that they would henceforth follow the ways of goodness which the Messenger (peace be upon him) of Allah may enjoin.

نام

اس سورہ کی آیت نمبر 10 میں حکم دیا گیا ہے کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں ان کا امتحان لیا جائے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام الممتحنہ رکھا گیا ہے۔ اس کا تلفظ مُمْتَحَنَہ بھی کیا جاتا ہے اور مُمْتَحِنَہ بھی۔ پہلے تلفظ کے لحاظ سے معنی ہیں ''وہ عورت جس کا امتحان لیا جائے''۔ اور دوسرے تلفظ کے لحاظ سے معنی ہیں ''امتحان لینے والی سورۃ''۔

زمانہ نزول

اس میں دو ایسے معاملات پر کلام فرمایا گیا ہے جن کا زمانہ تاریخی طور پر معلوم ہے۔ پہلا معاملہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا ہے جنہوں نے فتح مکہ سے کچھ مدت پہلے ایک خفیہ خط کے ذریعہ سے قریش کے سرداروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارادے کی اطلاع بھیجی تھی کہ آپ ان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اور دوسرا معاملہ ان مسلمان عورتوں کا ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے ہجرت کے کر کے مدینہ آنے لگی تھیں اور ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شرائط صلح کی رو سے مسلمان مردوں کی طرح کیا ان عورتوں کو بھی کفار کے حوالہ کر دیا جائے؟ ان دو معاملات کے ذکر سے یہ بات قطعی طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ یہ سورہ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی دور میں نازل ہوئی ہے ان کے علاوہ ایک تیسرا معاملہ بھی ہے جس کا ذکر سورۃ کے آخر میں آیا ہے، اور وہ یہ کہ جب عورتیں ایمان لا کر بیعت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوں تو آپ ان سے کن باتوں کا عہد لیں۔ اس حصے کے متعلق بھی قیاس یہی ہے کہ یہ بھی فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوا ہے کیونکہ فتح مکہ کے بعد قریش کے مردوں کی طرح ان کی عورتیں بھی بہت بڑی تعداد میں بیک وقت داخل اسلام ہونے والی تھیں اور اسی موقع پر یہ ضرورت پیش آئی تھی کہ اجتماعی طور پر ان سے عہد لیا جائے۔

موضوع اور مباحث

اس سورۃ کے تین حصے ہیں :

پہلا حصہ آغاز سورہ سے آیت 9 تک چلتا ہے اور سورۃ کے خاتمہ پر آیت 13 بھی اسی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے اس فعل پر سخت گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے محض اپنے اہل و عیال کو بچانے کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت اہم جنگی راز سے دشمنوں کو خبر دار کرنے کی کوشش کی تھی جسے اگر بروقت ناکام نہ کر دیا گیا ہوتا تو فتح مکہ کے موقع پر بڑا کشت و خون ہوتا، مسلمانوں کی بھی بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوتیں، قریش کے بھی بہت سے وہ لوگ مارے جاتے جو بعد میں اسلام کی عظیم خدمات انجام دینے والے تھے، وہ تمام فوائد بھی ضائع ہو جاتے جو مکہ کو پر امن طریقہ سے فتح کرنے کی صورت میں حاصل ہو سکتے تھے، اور اتنے عظیم نقصانات صرف اس وجہ سے ہوتے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اپنے بال بچوں کو جنگ کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس شدید غلطی پر تنبیہ فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تمام اہل ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ کسی مومن کو کسی حال میں اور کسی غرض کے لیے بھی اسلام کے دشمن کافروں کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق نہ رکھنا چاہیے اور کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے جو کفر و اسلام کی کشمکش میں کفار کے لیے مفید ہو۔ البتہ جو کافر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عملاً دشمنی اور ایذا رسانی کا برتاؤ نہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا حصہ آیات 10-11 پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک اہم معاشرتی مسئلے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو اس وقت بڑی پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔ مکہ میں بہت سی مسلمان عورتیں ایسی تھیں جن کے شوہر کافر تھے اور وہ کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ پہنچ جاتی تھیں۔ اسی طرح مدینہ میں بہت سے مسلمان مرد ایسے تھے جن کی بیویاں

کافر تھیں اور وہ مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ان کے درمیان رشتہ ازدواج باقی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ فرما دیا کہ مسلمان عورت کے لیے کافر شوہر حلال نہیں ہے، اور مسلمان مرد کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ مشرک بیوی کو اپنے نکاح میں رکھے۔ یہ فیصلہ بڑے اہم قانونی نتائج رکھتا ہے جن کی تفصیل ہم آگے اپنے حواشی میں بیان کریں گے۔

تیسرا حصہ آیت 12 پر مشتمل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو عورتیں اسلام قبول کریں ان سے آپ ان بڑی بڑی برائیوں سے بچنے کا عہد لیں جو جاہلیت عرب کے معاشرے میں عورتوں کے اندر پھیلی ہوئی تھیں اور اس بات کا اقرار کرائیں کہ آئندہ وہ بھلائی کے ان تمام طریقوں کی پیروی کریں گی جن کا حکم اللہ کے رسول کی طرف سے ان کو دیا جائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔	In the name of Allah, Most Gracious, Most Merciful.
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَ قَدۡ كَفَرُوۡا بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَاِیَّاكُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ۚ تُسِرُّوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ	اے وہ لوگوں *1 جو ایمان لائے نہ بناؤ میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست۔ پیغام بھیجتے ہو انکی طرف دوستی کے جبکہ وہ انکار کر چکے ہیں اسکا جو آیا ہے تمہارے پاس حق میں سے۔ وہ جلاوطن کرتے ہیں رسول کو اور تمکو اس بنا پر کہ ایمان لائے ہو تم اللہ پر جو تمہارا رب ہے۔ اگر تم نکلے ہو لڑنے	1. O those*1 who believed, do not take My enemies and your enemies as friends, extending towards them affection while they disbelieved in that which has come to you from the truth. They drive out the Messenger and you because you have believed

in Allah, your Lord. If you have come forth to strive in My way and seeking My good pleasure, you secretly convey to them affection. And I know of what you have concealed, and what you have declared. And whoever does so from among you, then he has indeed gone astray from the right way.	کے لیے میری راہ میں اور حاصل کرنے کے لئے میری خوشنودی تم پوشیدہ پیغام بھیجتے ہو انکی طرف دوستی کے ۔اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو ۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا تم میں سے تو یقیناً وہ بھٹک گیا سیدھے راستے سے ۔	وَاَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَيۡتُمۡ وَمَاۤ اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ۝١

*1 It would be appropriate to give at the outset the details of the incident concerning which these verses were revealed so that the subject that follows is understood easily. The commentators agree, and Ibn Abbas, Mujahid, Qatadah, Urwah bin Zubair and others also have unanimously reported that these verses were revealed at the time when a letter of Hatib bin Abi Baltaa to the pagans of Makkah was intercepted.

It so happened that, when the Quraish broke the treaty of Hudaibiyah, the Prophet (peace be upon him) started making preparations for an invasion of Makkah, but he did

not tell anyone, except a few close companions, about the goal of the expedition. At about the same time a woman arrived from Makkah, who had been a slave-girl of the Bani Abdul Muttalib, and then after her freedom had adopted singing as her profession. She complained of poverty to the Prophet (peace be upon him) and requested for financial help. The Prophet (peace be upon him) appealed to Bani Abdul Muttalib and he satisfied her need. When she was about to leave for Makkah, Hatib bin Abi Baltaa met her and quietly gave her a letter addressed to some of the Makkah chiefs and paid her ten dinars so that she kept the secret and carried the letter to the addressees secretly. When she had just left Al-Madinah, Allah informed the Prophet (peace be upon him) of it. The Prophet (peace be upon him) immediately sent Ali, Zubair and Miqdad bin Aswad after her with the instruction: Make haste. At Raudah khaki (12 miles from Al-Madinah on the road to Makkah) you will meet a woman, who carries a letter from Hatib to the pagans of Makkah. Seize that letter by any means you like. If she delivers the letter willingly, let her go; if she refuses to deliver it, kill her. When these companions reached the place, they found the woman there. They demanded the letter from her. She replied that she had a letter. They searched her but could find no letter. At last, they told her to deliver the letter, otherwise they would strip her and search her. When she saw that there was no way of escape, she took out the letter from her hair-plait and delivered it to them, and they brought it to the Prophet (peace be upon him). When the

letter was opened and read, it was found to contain information to the Quraish that the Prophet (peace be upon him) was making preparations to attack them. (In different traditions different wordings of the letter have been reported but the purport of all is one and the same). The Prophet (peace be upon him) asked Hatib what induced him to act thus. He replied: Do not make haste in this matter of mine. I have not done this because I have become a disbeliever or an apostate, and have started preferring disbelief to Islam. But the truth is that my near and dear ones are still in Makkah. I do not belong to the tribe of the Quraish, but had settled there under the guardianship of some of them. The families of the Emigrants, which are still in Makkah, will be defended and protected by their tribes and clans, but I have no tribe which could give protection to my family. Therefore, I sent this letter in order to keep the Quraish under obligation so that they did not harm my children. (According to Hatib's son Abdur Rahman, Habit had his children and brother still in Makkah at that time, and according to Hatib's own report his mother was also there). Hearing what Hatib had to say, the Prophet (peace be upon him) said to the people: Hatib has told you the truth. That is, the real motive of his action was this and not any treachery against Islam or any intention to support disbelief. Umar rose and said: Permit me, O Messenger of Allah, that I should cut off this hypocrite's head. He has been treacherous to Allah and His Messenger and the Muslims. The Prophet (peace be upon him) said: This man has participated in the Battle of Badr. You may not know,

O Umar, Allah may have looked favorably at the people of Badr and said: Do as you please, I have forgiven you. (The words in the last sentence are different in different traditions. In some these are to the effect: I have granted you forgiveness; in some other: I am your forgiver; and in still an other: I will forgive you). Hearing this Umar wept and said: Allah and His Messenger have the best knowledge. This is a resume of those many traditions which Bukhari, Muslim, Ahmad, Abu Daud, Timidhi, Nasai, Ibn Jarir Tabari, Ibn Hisham, Ibn Hibban and Ibn Abi Hatim have related on the authority of several reliable transmitters. The most authentic of these is the tradition which Ali's secretary, Ubaidullah bin Abu Rafi, heard from Ali himself, and from him Ali's grandson, Hasan bin Muhammad bin Hanafiyah, heard and conveyed to the later reporters. In none of these there is any mention that Hatib was pardoned when he presented this excuse. But there is no hint either to show that he was awarded some punishment. That is why the Muslim scholars have concluded that Hatib's excuse was accepted and he was pardoned.

1* مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آغاز ہی میں اس واقعہ کی تفصیلات بیان کر دی جائیں جس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں تاکہ آگے کا مضمون سمجھنے میں آسانی ہو۔ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے اور ابن عباس، مجاہد، قتادہ، عروہ بن زبیر وغیرہ حضرات کی متفقہ روایت بھی یہی ہے کہ ان آیات کا نزول اس وقت ہوا تھا جب مشرکین مکہ کے نام حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا خط پکڑا گیا تھا۔

قصہ یہ ہے کہ جب قریش کے لوگوں نے صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مگر چند مخصوص صحابہ کے سوا کسی کو یہ نہ بتایا کہ آپ کس مہم پر جانا

چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مکہ معظمہ سے ایک عورت آئی جو پہلے بنی عبدالمطلب کی لونڈی تھی اور پھر آزاد ہو کر گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے آکر حضور سے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کچھ مال مدد مانگی۔ آپ نے بنی عبدالمطلب اور بنی المطلب سے اپیل کر کے اس کی حاجت پوری کر دی۔ جب وہ مکہ جانے لگی تو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اس سے ملے اور اس کو چپکے سے ایک خط بعض سرداران مکہ کے نام دیا اور دس دینار دیے تاکہ وہ راز فاش نہ کرے اور چھپا کر یہ خط ان لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینہ سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرما دیا۔ آپ نے فوراً حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت مقداد بن اسود کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ، روضہ خاخ کے مقام پر (مدینہ سے 12 میل بجانب مکہ) تم کو ایک عورت ملے گی جس کے پاس مشرکین کے نام حاطب کا ایک خط ہے۔ جس طرح بھی ہو اس سے وہ خط حاصل کرو۔ اگر وہ دے دے تو اسے چھوڑ دینا۔ نہ دے تو اس کو قتل کر دینا۔ یہ حضرات جب اس مقام پر پہنچے تو عورت وہاں موجود تھی۔ انہوں نے اس سے خط مانگا۔ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انہوں نے تلاشی لی۔ مگر کوئی خط نہ ملا۔ آخر کو انہوں نے کہا خط ہمارے حوالے کر ورنہ ہم برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اپنی چوٹی میں سے وہ خط نکال کر انہیں دے دیا اور یہ اسے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں قریش کے لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ (مختلف روایات میں خط کے الفاظ مختلف نقل ہوئے ہیں۔ مگر مدعا سب کا یہی ہے)۔ حضورؐ نے حضرت حاطب سے پوچھا، یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے عرض کیا آپ میرے معاملہ میں جلدی نہ فرمائیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس بنا پر نہیں کیا ہے کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقرباء مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں مہاجرین میں سے دوسرے جن لوگوں کے اہل و عیال مکہ میں ہیں ان کو تو ان کا قبیلہ بچا لے گا۔ مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جسے کوئی بچانے والا ہو۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر

کے وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں۔ (حضرت حاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کی روایت یہ ہے کہ اس وقت حضرت حاطب کے بچے اور بھائی مکہ میں تھے، اور خود حضرت حاطب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ماں بھی وہیں تھیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب کی یہ بات سن کر حاضرین سے فرمایا: قَدْ صدقکم، "حاطب نے تم سے سچی بات کہی ہے"، یعنی ان کے اس فعل کا اصل محرک یہی تھا، اسلام سے انحراف اور کفر کی حمایت کا جذبہ اس کا محرک نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن ماردوں، اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، اس شخص نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ تمہیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کیا۔" (اس آخری فقرے کے الفاظ مختلف روایات میں مختلف ہیں۔ کسی میں ہے قد غفرت لکم، میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔ کسی میں ہے انی غافر لکم، میں تمہیں بخش دینے والا ہوں۔ اور کسی میں ہے ساغفر لکم۔ میں تمہیں بخش دوں گا)۔ یہ بات سن کر حضرت عمرؓ رو دیے اور انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ ان کثیر التعداد روایات کا خلاصہ ہے جو متعدد معتبر سندوں سے بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن جریر طبری، ابن ہشام، ابن حبان اور ابن ابی حاتم نے نقل کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مستند روایت وہ ہے جو خود حضرت علیؓ کی زبان سے ان کے کاتب (سکریٹری) عبیداللہ بن ابی رافع نے سنی اور ان سے حضرت علی کے پوتے حسن بن محمد بن حنفیہ نے سن کر بعد کے راویوں تک پہنچائی۔ ان میں سے کسی روایت میں بھی یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت حاطب کا یہ عذر قبول کر کے انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

اِنۡ یَّثۡقَفُوۡكُمۡ يَكُوۡنُوۡا لَـكُمۡ اَعۡدَآءً وَّ يَبۡسُطُوۡۤا اِلَيۡكُمۡ	اگر وہ قابو پالیں تم پر تو ہو جائیں تمہارے دشمن اور چلائیں تم	2. If they gain the upper hand over you, they will become your

أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوٓءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ ﴿٢﴾

پر اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ اور وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم کافر ہو جاؤ۔ *2

enemies and they will extend against you their hands and their tongues with evil, and they wish that you would disbelieve. *2

*2 Although what has been said up to here, and what follows in this regard, was revealed in connection with the incident relating to Hatib, Allah, instead of dwelling on his case only, has given the believers this lesson forever. It is contrary to the profession of the faith that a person should act, out of any motive or reason, in a way detrimental to the interests of Islam and subservient to the interests of disbelief when a conflict is going on between Islam and disbelief and some people have adopted a hostile attitude towards the Muslims only because they are Muslims. Even if a person be wholly free from any ill-will against Islam and acts thus not with an evil intention but for the sake of a dire personal need, the act anyhow is unbecoming of a believer, and whoever acts thus strays from the right way.

*2 یہاں تک جو ارشاد ہوا ہے، اور آگے اسی سلسلے میں جو کچھ آرہا ہے، اگرچہ اس کے نزول کا موقع حضرت حاطب ہی کا واقعہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے تنہا انہی کے مقدمہ پر کلام فرمانے کے بجائے تمام اہل ایمان کو ہمیشہ کے لیے یہ درس دیا ہے کہ کفر و اسلام کا جہاں مقابلہ ہو، اور جہاں کچھ لوگ اہل ایمان سے ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر دشمنی کر رہے ہوں، وہاں کسی شخص کا کسی غرض اور کسی مصلحت سے بھی کوئی ایسا کام کرنا جس سے اسلام کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہو اور کفر و کفار کے مفاد کی خدمت ہوتی ہو، ایمان کے منافی

حرکت ہے۔ کوئی شخص اگر اسلام کی بد خواہی کے جذبہ سے بالکل خالی ہو اور بد نیتی سے نہیں بلکہ محض اپنی کسی شدید ترین ذاتی مصلحت کی خاطر ہی یہ کام کرے، پھر بھی یہ فعل کسی مومن کے کرنے کا نہیں ہے، اور جس نے بھی یہ کام کیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳	ہرگز نہ کام آئیں گے تمہیں تمہارے رشتے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن*3۔ وہ فیصلہ کردیگا تمہارے درمیان*4 اور اللہ اسکو جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔*5	3. Never will benefit you your relationships, nor your children on the Day of Judgment. *3 He will judge between you. *4 And Allah of whatever you do is All Seer. *5

*3 The allusion is to Hatib. As he had acted thus only in order to ensure that his mother and brother and children remained safe in the event of a war, it is being said: The relations for whose sake you have committed this grave error, will not save you on the Day of Resurrection. No one will dare come forward in the court of Allah and say: Our father, or our son, or our brother had committed this sin for our sake; therefore, we may be punished instead of him. At that time everyone will be worried only about himself, and weighed down with the anxiety of somehow saving himself from the consequences of his own acts, not to speak of being ready to take the burden of another's sins on him. This thing has been expressed in clearer words at several other places in the Quran. At one place it has been said: To save oneself from the torment of that Day, the culprit will

wish to give his children, his wife, his brother, his kinsfolk, who gave him shelter, and all the people of the earth, in ransom that this device might rescue him. (Surah Al-Maarij, Ayats 11-14). And at another place it is said: On the Day man shall flee from his brother and his mother and his father and his wife and his children. Each one of them, on that Day, shall have enough to occupy him so as to make him heedless of others. (Surah Abasa, Ayats 34-37).

*3 یہ اشارہ ہے حضرت حاطب کی طرف انہوں نے اپنی ماں، اپنے بھائی، اور اپنی اولاد کو جنگ کے موقع پر دشمنوں کی ایذا سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے جن کی خاطر اتنے بڑے قصور کا ارتکاب کر ڈالا وہ قیامت کے روز تمہیں بچانے کے لیے نہیں آئیں گے۔ کسی کی یہ ہمت نہیں ہو گی کہ خدا کی عدالت میں آگے بڑھ کر یہ کہے کہ ہمارے باپ یا ہمارے بیٹے یا ہمارے بھائی نے ہماری خاطر یہ گناہ کیا تھا اس لیے اس کے بدلے کی سزا ہمیں دے دی جائے۔ اس وقت ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہو گی، اپنے اعمال ہی کے خمیازے سے بچنے کا سوال ہر شخص کے لیے بلائے جان بن رہا ہو گا، کجا کہ کوئی کسی دوسرے کے حصے کا خمیازہ بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار ہو۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر زیادہ صریح الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ''اس روز مجرم یہ چاہے گا کہ اپنی اولاد، اپنے بیوی، اپنی بھائی، اپنی حمایت کرنے والے خاندان اور دنیا بھر کے لوگوں کو بھی اگر فدیے میں دے کر عذاب سے چھوٹ سکتا ہو تو انہیں بھینٹ چڑھا دے اور خود چھوٹ جائے'' (المعارج، آیات 11۔14)۔ دوسری جگہ فرمایا ''اس روز آدمی اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ہر ایک اپنے ہی حال میں ایسا گرفتار ہو گا جس میں اسے کسی کا ہوش نہ ہو گا'' (عبس، 34۔37)۔

*4 That is, all worldly relations and bonds of love and friendship shall be rendered void in the Hereafter. The people will not be judged as groups and parties and families, but every person will have to present himself as an individual and render his own account only. Therefore, no

one in the world should commit a wrong for the sake of a relationship or friendship or fraternity, for he will himself have to face all its consequences, and no one else will become a partner in a matter of his personal responsibility.

*4یعنی دنیا کے تمام رشتے، تعلقات، اور رابطے وہاں توڑ دیئے جائیں گے۔ جتھوں اور پارٹیوں اور خاندانوں کی شکل میں لوگوں کا محاسبہ نہ ہو گا، بلکہ ایک ایک فرد اپنی ذاتی حیثیت میں پیش ہو گا،اور ہر ایک کو اپنا ہی حساب دینا پڑے گا۔ اس لیے دنیا میں کسی شخص کو بھی کسی قرابت یا دوستی یا جتھہ بندی کی خاطر کوئی ناجائز کام نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اپنے کیے کی سزا اس کو خود ہی بھگتنی ہوگی، اس کی ذاتی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شریک نہ ہوگا۔

*5 The following conclusions are deduced from the details of the case of Hatib, as mentioned above, and the verses which were revealed in this connection:

(1) Whatever the motive of the person, it was in itself an act of espionage, and a very dangerous kind of espionage on a critical occasion. The enemy, who was absolutely unaware, had been informed of the immanent attack from Al-Madinah. Then it was not a case based on suspicion but a letter written by the concerned person himself had been intercepted, after which no other proof of the guilt was required. These were not peace but war time conditions; yet the Prophet (peace be upon him) did not place Hatib in confinement without giving him a chance of self defense. This option was also not given to him in private but publicly before the people. This makes it manifest that there is no room in Islam for such laws and regulations under which the ruler may have the right in any case to imprison a person only on the basis of his own knowledge

or suspicion. Islam also does not recognize the method of trying a person secretly in secret.

(2) Hatib was not only one of the emigrants but also a participant in the Battle of Badr, and enjoyed a distinguished place among the companions. But despite this a serious crime happened to be committed by him and Allah took him to task for this in the Quran as is evident from the above verses. In the Hadith too, his case has been narrated in detail and also among the commentators there may be none who has not made a reference to it. These are some of the evidences which prove that the companions were not innocent. They also could commit errors because of human weaknesses, and errors happened to be committed by them practically. The teaching of regarding them with respect and reverence that Allah and His Messenger (peace be upon him) have given, does not at all require that if one of them happened to commit an error, it should not be mentioned, for evidently, if this were their demand, neither would Allah have mentioned them in His Book, nor the companions and their successors and the traditionists and the commentators would have related their details in their traditions and books.

(3) The view that Umar expressed in the case of Hatib concerned the apparent aspect of the act. His reasoning was that the act was clearly in the nature of treachery to Allah and His Messenger (peace be upon him) and the Muslims. Therefore, Hatib was a hypocrite and deserved to be put to death. But the Prophet (peace be upon him) rejected his viewpoint and explained the viewpoint of the Islamic

Shariah, saying: Decision should not be given only on the outward form of the act but it should also be seen what evidence is given by the past life and general character of the person, who happens to commit the act and the circumstances under which he commits it. The act, no doubt, smacked of espionage but did the attitude of the person concerned towards Islam and the followers of Islam until then indicate that he could do such a thing with the intention of treachery to Allah and His Messenger (peace be upon him) and the Muslims. He was one of those who had emigrated for the sake of the faith. Could he have made such a sacrifice without sincerity? He fought in a critical battle like Badr for the sake of his faith when the Muslims were facing an enemy much better equipped and three times their number. Could the sincerity of such a person be doubted or could it be believed that he had the slightest inclination towards the Quraish. He was telling the plain truth that his family at Makkah did not enjoy the protection of any tribe or clan, which the families of the other emigrants enjoyed; therefore, he acted thus during war time only in order to safeguard his children from the persecution of the disbelievers. The facts confirmed that he did not really belong to any tribe at Makkah and this too was known that his family members were still back at Makkah. Therefore, there was no reason why his statement should be taken as false and the opinion formed that his real motive was not this but the intention of treachery. No doubt, for a sincere Muslim even with a good intention it was not lawful that he should inform the enemy of the

military plans of the Muslims only for the sake of his personal interests, yet there is a great difference between the error of a sincere Muslim and the treachery of a hypocrite. Both cannot be awarded the same punishment only on the basis of the similarity between their acts. This was the Prophet's (peace be upon him) decision in this case, and Allah confirmed it in the verses of Surah Al-Mumtahinah. A careful study of the above three verses will show that in these Allah has certainly reprimanded Hatib, but it is a kind of a reprimand administered to a believer and not the one administered to a hypocrite. Moreover, no penalty, or physical punishment was awarded to him, but he was administered a severe rebuke publicly and let off, which meant that in a Muslim society even a blot on the honor of a guilty believer and his falling into disrepute was also a very severe punishment.

(4) About the great merit of those companions who fought at Badr, the Prophet (peace be upon him) said: You may not know Allah might have looked favorably at the people of Badr and said: Do as you please, I have forgiven you. This does not mean that the companions of Badr were forgiven each and every sin and they were at liberty to commit whatever sin and crime they pleased, for forgiveness had already been guaranteed to them. This was neither meant by the Prophet (peace be upon him) nor the companions ever understood it in this meaning, nor any companion of Badr after hearing this good news ever thought that he was free to commit any sin, nor ever any rule was made on the basis of this in the Islamic Shariah

that if a companion of Badr happened to commit a sin, he should not be given any punishment for it. As a matter of fact, if one considers the circumstances under which this was said and the words that the Prophet (peace be upon him) used on this occasion carefully, one can clearly understand the meaning to be this: It would not be anything impossible if in view of the great and meritorious services that the companions rendered at Badr out of sincerity and devotion and at the very risk of their lives for the sake of Allah and His religion, Allah might have forgiven all their former and latter sins mercifully. Therefore, you should not suspect such a companion of treachery and hypocrisy, and should accept the excuse that he himself was presenting for his crime.

(5) From the Quran and the Prophet's (peace be upon him) sayings it also becomes evident that a Muslim's being involved in espionage for the disbelievers by itself is not a sufficient basis for the conclusion that he has become an apostate, or is devoid of the faith, or is a hypocrite. For reaching such a conclusion if there are some other circumstances and evidences, it would be a different thing; otherwise by itself this act is only a crime, not a sign of disbelief.

(6) From these verses of the Quran it also becomes evident that for a Muslim it is in no case permissible that he should spy for the disbelievers, no matter how gravely his own life and property, or that of his near and dear ones, might be endangered.

(7) When Umar asked for the Prophet's (peace be upon

him) permission to put Hatib to death for the crime of espionage, the Prophet (peace be upon him) did not say that the crime was not punishable with death, but declined permission on the ground that Hatib's being a companion of Badr was an express proof of his being sincere, and the statement given by him was correct that be had acted thus not out of any good wishes for the enemies but for the sake of safeguarding his family from any possible persecution to death. From this, one section of the jurists has argued that the general law in respect of a Muslim spy is that he should be put to death, unless there are very weighty reasons for awarding him a lesser punishment or a mere reprimand. But the jurists have disputed this question. Imam Shafei and some other jurists hold the view that the Muslim spy is punishable, but not with death. Imam Abu Hanifah and Imam Auzai maintain that he will be subjected to corporal punishment and long imprisonment. Imam Malik says that he will be put to death, but the Maliki jurists hold different views on this question. Ashhab says that the Muslim ruler has vast powers in this matter. He can exercise his judgment keeping in view the circumstances of the crime and the culprit and award him any punishment. A saying of Imam Malik and Ibn al-Qasim also is to the same effect. Ibn al Majishun and Abdul Malik bin Habib say that if the culprit is a habitual spy, he should be put to death. Ibn Wahb says that the punishment of the spy is death, but if he repents of spying, he may be pardoned. Sahnun says that one cannot know whether his repentance is genuine or deceptive; therefore, he should be put to death. There is

also a saying of Ibn al-Qasim in support of this. And Asbagh says that the belligerent spy is punishable with death, but the Muslim or dhimmi spy should be given corporal punishment instead of the death sentence, unless he be helping the enemies openly as against the Muslims. (Ibn al-Arabi, Ahkam al-Quran; Umdat al-Qari; Fath al-Bari.)

(8) The Hadith that has been cited above also permits that for the investigation of the crime not only the male but the female accused can also be stripped if so required. Although Ali, Zubair and Miqdad had not stripped the woman, yet they had threatened her that if she did not produce the letter, they would strip and search her. Obviously, if it were not lawful, the three illustrious companions could not have threatened her thus. And one can understand that they must have reported the story of their expedition on their return to the Prophet (peace be upon him). Had he expressed his displeasure, it must have been reported. That is why the jurists have held it as permissible. (Umdat al-Qari).

5*حضرت حاطب کے اس مقدمہ سے جس کی تفصیل اوپر ہم نے نقل کی ہے، اور ان آیات سے جو اس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :

(1) قطع نظر اس سے کہ کرنے والے نے کس نیت سے کیا، بجائے خود یہ فعل صریحاً ایک جاسوسی کا فعل تھا، اور جاسوسی بھی بڑے نازک موقع پر سخت خطرناک نوعیت کی تھی کہ حملے سے پہلے بے خبر دشمن کو خبردار کیا گیا تھا۔ پھر معاملہ شبہ کا بھی نہ تھا بلکہ ملزم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط پکڑ لیا گیا تھا جس کے بعد کسی ثبوت کی حاجت نہ تھی۔ حالات بھی زمانہ امن کے نہیں، زمانہ جنگ کے تھے۔ مگر اس کے باوجود نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے حضرت حاطب کو صفائی کا موقع دیے بغیر نظر بند نہیں کر دیا۔ اور صفائی کا موقع بھی ان کا بند کمرے میں نہیں بلکہ کھلی عدالت میں بر سر عام دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایسے قوانین و قواعد و ضوابط کی کوئی گنجائش نہیں ہے جن کی رو سے کسی حالت میں حکام کو یہ حق پہنچتا ہو کہ کسی شخص کو محض اپنے علم یا شبہ کی بنا پر قید کر دیں۔ اور بند کمرے میں خفیہ طریقے پر مقدمہ چلانے کا طریقہ بھی اسلام میں نہیں ہے۔

(2) حضرت حاطب نہ صرف مہاجرین میں سے تھے بلکہ اہل بدر میں شامل تھے جنہیں صحابہ کے اندر بھی ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ مگر اس کے باوجود ان سے اتنا بڑا جرم سرزد ہو گیا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس شدت کے ساتھ گرفت فرمائی جسے اوپر کی آیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ احادیث میں بھی ان کا قصہ پوری تفصیل کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور مفسرین میں سے بھی شاید ہی کوئی ہو جس نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔ یہ من جملہ ان بہت سے شواہد کے ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ بے خطا نہیں تھے، ان سے بھی بشری کمزوریوں کی بنا پر خطائیں سرزد ہو سکتی تھیں اور عملاً ہوئیں، اور ان کے احترام کی جو تعلیم اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے کم از کم اس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان میں سے اگر کوئی غلط کام سرزد ہوا تو اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کا تقاضا یہ ہوتا تو نہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ان کا ذکر کرتا اور نہ صحابہ کرام اور تابعین اور محدثین و مفسرین اپنی روایات میں ان کی تفصیلات بیان کرتے۔

(3) حضرت حاطب کے مقدمہ میں حضرت عمرؓ نے جس رائے کا اظہار کیا وہ ان کے فعل کی ظاہری صورت کے لحاظ سے تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ فعل ایسا ہے جو صریحاً اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی نوعیت رکھتا ہے، اس لیے حاطب منافق اور واجب القتل ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ان کے اس نقطہ نظر کو رد فرما دیا اور اسلامی شریعت کا اصل نقطہ نظر یہ بتایا کہ محض فعل کی ظاہری شکل پر ہی فیصلہ نہیں کر دینا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس شخص سے یہ صادر ہوا ہے اس کی پچھلی زندگی اور مجموعی سیرت کیا شہادت دیتی ہے اور قرائن کس بات پر دلالت کرتے ہیں۔ فعل کی شکل بلاشبہ

جاسوسی کی ہے۔ مگر کیا اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ فاعل کا آج تک کا رویہ یہی بتا رہا ہے کہ یہ شخص یہ کام اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی نیت سے کر سکتا تھا؟ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے ایمان کی خاطر ہجرت کی۔ کیا خلوص کے بغیر وہ اتنی بڑی قربانی کر سکتا تھا؟ یا اس کے بارے میں یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے دل میں کفار قریش کی طرف کوئی ادنیٰ سا میلان بھی موجود ہے؟ وہ اپنے فعل کی صاف صاف وجہ یہ بتا رہا ہے کہ مکہ میں اس کے بال بچوں کو خاندان اور قبیلے کا وہ تحفظ حاصل نہیں ہے جو دوسرے مہاجرین کو حاصل ہے، اس لیے اس نے ان کو جنگ کے موقع پر کفار کی ایذا رسانی سے بچانے کی خاطر یہ کام کیا ہے۔ حقائق اس کی تائید کرتے ہیں کہ فی الواقع مکہ میں اس کا کوئی قبیلہ نہیں ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ واقعی اس کے بال بچے وہاں موجود ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے اس بیان کو جھوٹا سمجھا جائے اور یہ رائے قائم کی جائے کہ اس کے اس فعل کا اصل محرک یہ نہ تھا بلکہ خیانت ہی کا ارادہ اس کے اندر پایا جاتا تھا۔ بلاشبہ ایک مخلص مسلمان کے لیے نیک نیتی سے بھی یہ حرکت جائز نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دشمنوں کو مسلمانوں کے جنگی منصوبوں کی خبر بہم پہنچائے، لیکن مخلص کی غلطی اور منافق کی غداری میں بڑا فرق ہے۔ محض نوعیت فعل کی بنا پر دونوں کی ایک ہی سزا نہیں ہو سکتی۔ یہ تھا اس مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ، اور اللہ تعالیٰ نے سورہ ممتحنہ کی ان آیات میں اس کی تائید فرمائی۔ اوپر کی تینوں آیات کو غور سے پڑھیے تو صاف محسوس ہوگا کہ ان میں حضرت حاطب پر عتاب تو ضرور فرمایا گیا ہے، مگر یہ عتاب اس طرز کا ہے جو ایک مومن کے لیے ہوتا ہے نہ کہ وہ جو ایک منافق کے لیے ہوا کرتا ہے۔ مزید برآں ان کے لیے کوئی مالی یا جسمانی سزا تجویز نہیں کی گئی ہے بلکہ علانیہ سخت زجر و توبیخ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم معاشرے میں ایک خطا کار مومن کی عزت کو بٹہ لگ جانا اور اس کے اعتماد پر حرف آجانا بھی اس کے لیے ایک بڑی سزا ہے۔

(4) ۔ بدری صحابہ کی فضیلت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ”تمہیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تم کو معاف کر دیا“۔ اس کے معنی یہ نہ تھے کہ بدری صحابیوں کو سات خون معاف ہیں، اور انہیں کھلی چھٹی ہے کہ دنیا میں جو گناہ اور جو جرم

بھی کرنا چاہیں کرتے رہیں، مغفرت کی انکو پیشگی ضمانت حاصل ہے۔ یہ مطلب نہ حضورؐ کا تھا، نہ صحابہ نے کبھی اس ارشاد کا یہ مطلب لیا، نہ کسی بدری صحابی نے یہ بشارت سن کر اپنے آپ کو ہر گناہ کرنے کے لیے آزاد سمجھا، اور نہ اسلامی شریعت میں اس کی بنا پر ایسا کوئی قاعدہ بنایا گیا کہ بدری صحابی سے اگر کوئی جرم سرزد ہو تو اسے کوئی سزا نہ دی جائے۔ دراصل جس موقع و محل میں یہ بات فرمائی گئی تھی اس پر، اور خود ان الفاظ پر جو آپ نے استعمال فرمائے ہیں، اگر غور کیا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اہل بدر نے اللہ اور اس کے دین کے لیے اخلاص اور سرفروشی و جانبازی کا اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہوں تو یہ بھی اس خدمت اور اللہ کے کرم کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید از امکان نہیں ہے، لہٰذا ایک بدری پر خیانت اور منافقت کا شبہ نہ کرو، اور اپنے جرم کا جو سبب وہ خود بیان کر رہا ہے اسے قبول کر لو۔

(5) قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان کا کفار کے لیے جاسوسی کر بیٹھنا بجائے خود اس بات کا فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ مرتد ہو گیا ہے، یا ایمان سے خارج ہے، یا منافق ہے۔ ایسا فیصلہ کرنے کے لیے اگر کچھ دوسرے قرائن و شواہد موجود ہوں تو بات الگ ہے، ورنہ اپنی جگہ یہ فعل صرف ایک جرم ہے، کفر نہیں ہے۔

(6) ۔ قرآن مجید کی ان آیات سے یہ بات بھی واضح ہے کہ مسلمان کے لیے کفار کی جاسوسی کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، خواہ اس کی یا اس کے قریب ترین عزیزوں کی جان و مال کو کیسا ہی خطرہ لاحق ہو۔

(7)۔ حضرت عمرؓ نے جب حضرت حاطب کو جاسوسی کے جرم میں قتل کرنے کی اجازت طلب کی تو حضور نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ یہ جرم مستوجب قتل نہیں ہے، بلکہ اجازت دینے سے انکار اس بنا پر کیا کہ حاطب کا بدری ہونا ان کے مخلص ہونے کا صریح ثبوت ہے اور ان کا یہ بیان صحیح ہے کہ انہوں نے دشمنوں کی خیر خواہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے بال بچوں کو ہلاکت کے خطرے سے بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اس سے فقہاء کے ایک گروہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان جاسوس کے لیے عام قانون یہی ہے کہ اسے قتل کیا جائے الّا یہ کہ بہت وزنی وجوہ اسے کم تر سزا دینے یا محض ملامت کر کے چھوڑ دینے کے لیے

موجود ہوں۔ مگر فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ اور بعض دوسرے فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان جاسوس کو تعزیر دی جائے گی مگر اس کا قتل جائز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اسے جسمانی عقوبت اور طویل قید کی سزا دی جائے گی۔ امام مالک کہتے ہیں کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ لیکن مالکی فقہاء کے اقوال اس مسئلے میں مختلف ہیں۔ اَشہب کہتے ہیں کہ امام کو اس معاملہ میں وسیع اختیارات حاصل ہیں، جرم اور مجرم کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے اجتہاد سے کوئی سزا دے سکتا ہے۔ ایک قول امام مالک اور ابن القاسم کا بھی یہی ہے۔ ابن الماجشون اور عبدالملک بن حبیب کہتے ہیں کہ اگر مجرم نے جاسوسی کی عادت ہی بنالی ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ ابن وہب کہتے ہیں کہ جاسوس کی سزا تو قتل ہی ہے مگر وہ اس فعل سے تائب ہو جائے تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے۔ سحنون کہتے ہیں کہ اس کی توبہ صحیح ہے یا محض فریب، اس کا علم آخر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لیے اسے قتل ہی کیا جانا چاہیے۔ ابن القاسم کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ اور اصبغ کہتے ہیں کہ حربی جاسوس کی سزا قتل ہے، مگر مسلم اور ذمیّ جاسوس کو قتل کے بجائے عقوبت دی جائے گی، الاّ یہ کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دشمنوں کی کھلی کھلی مدد کر رہا ہو۔ (احکام القرآن، ابن العربی۔ عمدۃ القاری، فتح الباری)۔

(8) حدیث مذکور سے اس امر کا جواز بھی نکلتا ہے کہ تفتیش جرم کے لیے اگر ضرورت پڑے تو ملزم مرد ہی نہیں، عورت کے کپڑے بھی اتارے جاسکتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ نے اگرچہ اس عورت کو برہنہ نہیں کیا تھا، لیکن انہوں نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ خط حوالے نہ کرے گی تو وہ اسے برہنہ کر کے اس کی تلاشی لیں گے۔ ظاہر ہے اگر یہ فعل جائز نہ ہوتا تو یہ تین جلیل القدر صحابی اس کی دھمکی نہیں دے سکتے تھے۔ اور قیاس یہ کہتا ہے کہ انہوں نے ضرور واپس جاکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مہم کی روداد سنائی ہوگی۔ حضورؐ نے اگر اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہوتا تو وہ ضرور منقول ہوتا۔ اسی لیے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے (عمدۃ القاری)۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	بلا شبہ ہے تمہارے لیے ایک عمدہ	4. Indeed, there is for you an excellent example
فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ	نمونہ ابراہیم میں اور ان لوگوں میں	

قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا
مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا
وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ
اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ
اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ
لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ
لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا
عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا
وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

جو اسکے ساتھ تھے۔ جب کہا انہوں
نے اپنی قوم سے بیشک ہم بری
ہیں تم سے اور جنکو تم پوجتے ہو
سوائے اللہ کے۔ ہم انکار کرتے
ہیں تمہارا *6 اور ہو گئی ہے
ہمارے اور تمہارے درمیان
عداوت اور بغض ہمیشہ کو یہاں
تک کہ ایمان لاؤ تم ایک اللہ پر
۔ مگر ابراہیم کا قول اپنے باپ سے
کہ میں ضرور مغفرت مانگوں گا
تیرے لئے اور نہیں اختیار رکھتا
میں تیرے بارے میں اللہ کے
سامنے کسی چیز کا *7۔ ہمارے رب
تجھ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا اور
تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے
ہیں اور تیرے ہی طرف لوٹنا ہے۔

in Abraham and those with him, when they said to their people: "Surely, we are disassociated from you and from whatever you worship besides Allah. We have rejected you, *6 and there has arisen, between us and you, hostility and hatred for ever, until you believe in Allah, the One." Except for the saying of Abraham to his father, certainly I shall ask forgiveness for you, though no power do I have for you before Allah over anything. *7 "Our Lord, in You have we put our

trust, and to You have we turned, and to You is the journeying."

*6 That is, we reject you. We neither consider you to be in the right nor your religion. The inevitable demand of the faith in Allah is denial of *taghut* (Satan): Whoever rejects *taghut* and believes in Allah has taken a firm support that never gives way. (Surah Al-Baqarah, Ayat 256).

6*یعنی ہم تمہارے کافر ہیں، نہ تمہیں حق پر مانتے ہیں نہ تمہارے دین کو۔ اللہ پر ایمان کا لازمی تقاضا طاغوت سے کفر ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِا لطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ ''پس جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے در حقیقت مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے'' (البقرہ،256)۔

*7 In other words, it means: Though there is an excellent example for you in Abraham's (peace be upon him) conduct in that he expressed disapproval of his pagan people and broke off all connections with them, yet his promise to pray for the forgiveness of his pagan father and then carrying it out practically is not worth following, for the believers should not have even this much relationship of love and sympathy with the disbelievers. In Surah At-Taubah, Ayat 113, Allah has clearly warned: It does not behoove the Prophet (peace be upon him) and those who have believed that they should pray for the forgiveness of the polytheists even though they be near kinsmen. Thus, no Muslim is allowed to pray for the forgiveness of his unbelieving kinsmen on the basis of the argument that the

Prophet Abraham (peace be upon him) had done so. As for the question, why did the Prophet Abraham (peace be upon him) pray thus, and did he carry out his promise practically. The answer has been provided by the Quran in full detail. When his father expelled him from the house, he had said on his departure: I bid you farewell: I will pray to my Lord for your forgiveness. (Surah Maryam, Ayat 47). On the basis of this very promise he prayed for him twice. One prayer is contained in Surah Ibrahim, Ayat 41: Lord, forgive me and my parents and the believers on the Day when reckoning will be hold. And the second prayer is in Surah Ash Shuara, Ayat 86: Forgive my father, for indeed he is from among those who have strayed and do not disgrace me on the Day when the people will be raised back to life. But afterwards when he realized that the father for whose forgiveness he was praying, wan an enemy of Allah, he excused himself from it and broke off even this relationship of love and sympathy with him.

As regards to the prayer of Abraham for his father, it was only to fulfill a promise he bad made to him, but when he realized that he was an enemy of Allah, he disowned him. The fact is that Abraham was a tender-hearted, God fearing and forbearing man. (Surah At-Taubah, Ayat 114).

A study of these verses makes the principle manifest that only that act of the prophet is worthy of following, which they persistently practiced till the end. As regards to those acts which they themselves gave up or which Allah restrained them from practicing or which were forbidden in the divine Shariah, they are not worth following, and no

one showed follow such acts of theirs on the basis of the argument that that was such and such a prophet's practice. Here also another question arises which may create confusion in some minds. In the verse under discussion, the saying of the Abraham (peace be upon him), which Allah has declared as not worth following, has two parts. The first part is that he said to his father: I will pray for your forgiveness, and the second: I have no power to get anything for you from Allah. Of these the first thing of not being a worthy examples to be followed is understandable, but, what is wrong with the second thing that that too has been made an exception from being an example worthily of imitation, whereas it by itself is a truth? The answer is that the saying of the Abraham (peace be upon him) has been included in the exception for the reason that when a person after making a promise with another to do something, says that it is not in his power to do anything beyond that for him, it automatically gives the meaning that if it were in his power to do anything further for him, he would have done that too for his sake. This makes his relationship of sympathy with the other person even more manifest. On that very basis this second part of the saying of the Prophet Abraham (peace be upon him) also deserved to be included in the exception, although its subject was true in so far as it does not lie even in the power of a Prophet to have a person forgiven by Allah. Allama Alusi in his Ruhal-Maani has also given this same answer to this question.

*7 دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے حضرت ابراہیم کی یہ بات تو قابل تقلید ہے کہ

انہوں نے اپنی کافر و مشرک قوم سے صاف صاف بیزاری اور قطع تعلق کا اعلان کر دیا، مگر ان کی یہ بات تقلید کے قابل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے مشرک باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا وعدہ کیا اور عملاً اس کے حق میں دعا کی۔ اس لیے کہ کافروں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا اتنا تعلق بھی اہل ایمان کو نہ رکھنا چاہیے۔ سورہ توبہ (آیت 113) میں اللہ تعالیٰ کا صاف صاف ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى۔ ''نبی کا یہ کام نہیں ہے اور نہ ان لوگوں کو یہ زیبا ہے جو ایمان لائے ہیں کہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں''۔ پس کوئی مسلمان اس دلیل سے اپنے کافر عزیزوں کے حق میں دعائے مغفرت کرنے کا مجاز نہیں ہے کہ یہ کام حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا۔ رہا سوال کہ خود حضرت ابراہیمؑ نے یہ کام کیسے کیا؟ اور کیا وہ اس پر قائم بھی رہے؟ اس کا جواب قرآن مجید میں ہم کو پوری تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کے باپ نے جب ان کو گھر سے نکال دیا تو چلتے وقت انہوں نے کہا تھا سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ، ''آپ کو سلام ہے، میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا'' (مریم، 147۔ اسی وعدے کی بنا پر انہوں نے دو مرتبہ اس کے حق میں دعا کی۔ ایک دعا کا ذکر سورہ ابراہیم (آیت 41) میں ہے: رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ ''اے ہمارے پروردگار، مجھے اور میرے والدین کو اور سب مومنوں کو اس روز معاف کر دیجیو جب حساب لیا جانا ہے''۔ اور دوسری دعا سورہ شعراء (آیت 86) میں ہے:

وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّاۗلِّيْنَ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ۔ ''میرے باپ کو معاف فرما دے کہ وہ گمراہوں میں سے تھا اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جب سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے''۔ لیکن بعد میں جب ان کو یہ احساس ہو گیا کہ اپنے جس باپ کی مغفرت کے لیے وہ دعا کر رہے ہیں وہ تو اللہ کا دشمن تھا، تو انہوں نے اس سے تبرّی کی اور اس کے ساتھ ہمدردی و محبت کا یہ تعلق بھی توڑ لیا:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ، اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (التوبہ 114)

اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرنا اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھا کہ ایک وعدہ تھا جو اس نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔ پھر جب اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن تھا تو اس نے اس سے بیزاری کا اظہار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم ایک رقیق القلب اور نرم خو آدمی تھا۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ اصولی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء کا صرف وہی عمل قابل تقلید ہے جس پر وہ آخر وقت تک قائم رہے ہوں۔ رہے ان کے وہ اعمال جن کو انہوں نے بعد میں خود چھوڑ دیا ہو، یا جن پر اللہ تعالیٰ نے انہیں قائم نہ رہنے دیا ہو، یا جن کی ممانعت اللہ کی شریعت میں وارد ہو چکی ہو، وہ قابل تقلید نہیں ہیں اور کوئی شخص اس حجت سے ان کے ایسے اعمال کی پیروی نہیں کر سکتا کہ یہ فلاں نبی کا عمل ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جو آدمی کے ذہن میں کھٹک پیدا کر سکتا ہے۔ آیت زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے جس قول کو قابل تقلید نمونہ ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اس کے دو حصے ہیں ایک حصہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا ”میں آپ کے لیے مغفرت کی دعا کروں گا“۔ اور دوسرا حصہ یہ کہ ”میرے بس میں کچھ نہیں ہے کہ اللہ سے آپ کو معافی دلوا دوں“۔ ان میں سے پہلی بات کا قابل تقلید نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر دوسری بات میں کیا خرابی ہے کہ اسے بھی نمونہ قابل تقلید ہونے سے مستثنیٰ کر دیا گیا؟ حالانکہ وہ بجائے خود حق بات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول استثناء میں اس وجہ سے داخل ہوا ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے ایک کام کا وعدہ کرنے کے بعد یہ کہتا ہے کہ اس سے زیادہ تیرے لیے کچھ کرنا میرے بس میں نہیں ہے تو اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر اس سے زیادہ کچھ کرنا اس کے بس میں ہوتا تو وہ شخص اس کی خاطر وہ بھی کرتا۔ یہ بات اس آدمی کے ساتھ اس شخص کے ہمدردانہ تعلق کو اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کا یہ دوسرا قول بھی استثناء میں شامل کیے جانے کا مستحق تھا، اگرچہ اس کا یہ مضمون بجائے خود برحق تھا کہ اللہ سے کسی کی مغفرت کروا دینا ایک نبی کے اختیار سے باہر ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی روح المعانی میں اس سوال کا

یہی جواب دیا ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَاغۡفِرۡ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝	ہمارے رب نہ بنانا تو ہمیں آزمائش ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا*8 اور معاف فرما ہمیں ہمارے رب۔ یقیناً تو ہے غالب حکمت والا۔	5. “Our Lord, make us not a trial for those who have disbelieved. *8 And forgive us, our Lord. Indeed You are the All Mighty, the All Wise.”

*8 There are several ways in which the believers can become a cause of trial for the disbelievers, for which every believer should seek Allah’s refuge. For example:
(1) The disbelievers may gain upper hand over them and consider it a proof of their being in the right and the believers being in the wrong.
(2) The persecution of the believers by the disbelievers may become unbearable with the result that they may yield to them and abandon their faith and moral values. This would subject the believers to public ridicule and would provide the disbelievers with an opportunity to humiliate and debase them and their religion.
(3) In spite of being the standard-bearers of the true faith the believers may lose their moral superiority that should accrue to them as believers. And the people may see the same defects and deficiencies in their character as are commonly found in an un-Islamic community. This would give the disbelievers an opportunity to say that the faith of the believers was in no way superior to their disbelief. (For

further details sec E.N. 8.3 of Surah Younus).

*8 کافروں کے لیے اہل ایمان کے فتنہ بننے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں جن سے ہر مومن کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کافر ان پر غالب آجائیں اور اپنے غلبہ کو اس بات کی دلیل قرار دیں کہ ہم حق پر ہیں اور اہل ایمان برسر باطل، ورنہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کو خدا کی رضا حاصل ہوتی اور پھر بھی ہمیں ان پر غلبہ حاصل ہوتا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان پر کافروں کا ظلم و ستم ان کی حد برداشت سے بڑھ جائے اور آخر کار وہ ان سے دب کر اپنے دین و اخلاق کا سودا کرنے پر اتر آئیں۔ یہ چیز دنیا بھر میں مومنوں کی جگ ہنسائی کی موجب ہوگی اور کافروں کو اس سے دین اور اہل دین کی تذلیل کا موقع ملے گا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دین حق کی نمائندگی کے مقام بلند پر فائز ہونے کے باوجود اہل ایمان اس اخلاقی فضیلت سے محروم رہیں جو اس مقام کے شایان شان ہے، اور دنیا کو ان کی سیرت و کردار میں بھی وہی عیوب نظر آئیں جو جاہلیت کے معاشرے میں عام طور پر پھیلے ہوئے ہوں۔ اس سے کافروں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ اس دین میں آخر وہ کیا خوبی ہے جو اسے ہمارے کفر پر شرف عطا کرتی ہو؟ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ 83)۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٦﴾	بیشک ہے تمہارے لئے ان میں بہترین نمونہ اسکے لئے جو امید رکھتا ہے اللہ (سے ملاقات) کی اور روز آخرت کی*9۔ اور وہ جو روگردانی کرے تو بیشک اللہ وہ ہے بے نیاز لائق حمد وثنا۔*10	6. Certainly there is for you in them an excellent example, for him who is hopeful of (meeting with) Allah and the Last Day. *9 And whoever turns away, then indeed Allah, He is All Sufficient, Self Praiseworthy. *10

*9 Who is hopeful of Allah and the Last Day: Who expects that one Day he will have to present himself before Allah and is hopeful that Allah will treat him benevolently and help him attain to success in the Hereafter.

*9یعنی جو اس بات کی توقع رکھتا ہو کہ ایک روز اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے، اور اس چیز کا امیدوار ہو کہ اللہ اسے اپنے فضل سے نوازے اور روز آخر میں اسے سرخروئی نصیب ہو۔

*10 That is, Allah has no need of such believers, who profess to believe in His religion as well as maintain friendly relations with His enemies. He is Self Sufficient: His Godhead does not require that they should acknowledge Him as God. He is Self-Praiseworthy, i.e. His being praiseworthy is not dependent on the people's praising and glorifying Him. If they affirm the faith, they do so not for any good of Allah, but for their own good. And they cannot gain anything from their affirmation of the faith until they break off all connections of love and friendship with the enemies of Allah as the Prophet Abraham (peace be upon him) and his companions did.

*10یعنی اللہ کو ایسے ایمان لانے والوں کی کوئی حاجت نہیں ہے جو اس کے دین کو ماننے کا دعویٰ بھی کریں اور پھر اس کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھیں۔ وہ بے نیاز ہے۔ اس کی خدائی اس کی محتاج نہیں ہے کہ یہ لوگ اسے خدا مانیں۔ اور وہ اپنی ذات میں آپ محمود ہے، اس کا محمود ہونا اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ یہ اس کی حمد کریں۔ یہ اگر ایمان لاتے ہیں تو اللہ کے کسی فائدے کے لیے نہیں، اپنے فائدے کے لیے لاتے ہیں۔ اور انہیں ایمان کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک یہ حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی طرح اللہ کے دشمنوں سے محبت اور دوستی کے رشتے توڑ نہ لیں۔

عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّجۡعَلَ بَيۡنَكُمۡ وَ بَيۡنَ الَّذِيۡنَ عَادَيۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيۡرٌ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۷﴾	شاید یہ کہ اللہ پیدا کر دے تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تم دشمنی رکھتے ہو ان میں سے *11 دوستی ۔ اور اللہ قادر ہے ۔ اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان ۔	7. It may be that Allah will grant between you and those, you are at enmity with whom, *11 affection. And Allah is All Powerful. And Allah is All Forgiving, All Merciful.

*11 Although the true believers were following the exhortation to sever their connections with the unbelieving kinsmen patiently, yet Allah knew how hard it was to break off one's connections with his parents, brothers and sisters and near relations. Therefore, Allah consoled them with the hope that a time would soon come when their same relations would become Muslims and their today's enmity would again change into love tomorrow. When this thing was said no one could understand how this would happen. But hardly a few weeks had passed after the revelation of these verses when Makkah fell and the people of Quraish began to enter Islam in large numbers, and the Muslims witnessed with their own eyes how the hope they were given materialized.

*11 اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو اپنے کافر رشتہ داروں سے قطع تعلق کی جو تلقین کی گئی تھی اس پر سچے اہل ایمان اگرچہ بڑے صبر کے ساتھ عمل کر رہے تھے، مگر اللہ کو معلوم تھا کہ اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور قریب ترین عزیزوں سے تعلق توڑ لینا کیسا سخت کام ہے اور اس سے اہل ایمان کے دلوں پر کیا کچھ گزر رہی

ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب تمہارے یہی رشتہ دار مسلمان ہو جائیں گے اور آج کی دشمنی کل پھر محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ جب یہ بات فرمائی گئی تھی اس وقت کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ نتیجہ کیسے رونما ہو گا۔ مگر ان آیات کے نزول پر چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ مکہ فتح ہو گیا، قریش کے لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے اور مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس چیز کی انہیں امید دلائی گئی تھی وہ کیسے پوری ہوئی۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝	نہیں منع کرتا تمہیں اللہ ان لوگوں کے بارے میں نہیں جنگ کی جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں اور نہ نکالا تمہیں تمہارے گھروں سے کہ بھلائی کرو ان سے اور انصاف کرو انکے ساتھ ۔بیشک اللہ محبوب رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو۔ *12	8. Allah does not forbid you, regarding those who have neither fought you in the matter of religion, nor driven you out of your homes, that you treat them kindly and deal justly towards them Indeed Allah loves those who are just. *12

*12 Here a doubt may arise in the minds. It is all right to treat the disbelievers, who are not hostile, kindly, but should only they be treated unjustly? And should the disbelievers, who arc hostile, be treated unjustly? The answer is that in this context, the word justice, in fact, has been used in a special sense. It means: Justice demands that you should not be hostile to those who are not hostile to you, for it is not justice to treat the enemy and the non-

enemy alike. You have every right to adopt a stern attitude towards those who persecuted you for embracing Islam and compelled you to leave your homes and pursued you even after your expulsion. But as for those who were not partners in persecuting you, you should treat them well and should fulfill the right they have on you because of blood and other relationships.

12*اس مقام پر ایک شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ دشمنی نہ کرنے والے کافروں کے ساتھ نیک برتاؤ تو خیر ٹھیک ہے، مگر کیا انصاف بھی صرف انہی کے لیے مخصوص ہے؟ اور کیا دشمن کافروں کے ساتھ بے انصافی کرنی چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سیاق و سباق میں دراصل انصاف ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ عداوت نہیں برتتا، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ عداوت نہ برتو۔ دشمن اور غیر دشمن کو ایک درجہ میں رکھنا اور دونوں سے ایک ہی سلوک کرنا انصاف نہیں ہے۔ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا حق ہے جنھوں نے ایمان لانے کی پاداش میں تم پر ظلم توڑے اور تم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کیا، اور نکالنے کے بعد بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔ مگر جن لوگوں نے اس ظلم میں کوئی حصہ نہیں لیا، انصاف یہ ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور رشتے اور برادری کے لحاظ سے ان کے جو حقوق تم پر عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرنے میں کمی نہ کرو۔

9. Allah only forbids you, regarding those who fought you in (the matter of) religion, and expelled you from your homes, and	البتہ منع کرتا ہے تمہیں اللہ ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے جنگ کی تم سے دین (کے معاملے) میں اور نکالا تمکو تمہارے گھروں سے اور مدد کی	اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظَاهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ

helped in your expulsion, that you take them for friends. And those who take them for friends, then it is those who are the wrongdoers. *13	تمہارے نکالنے میں کہ تم ان سے دوستی کرو۔اور جو ان سے دوستی کریں تو وہی لوگ ہیں ظالم۔ *13	تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

*13 The instructions to sever relations with the disbelievers given in the preceding verses, could cause the people the misunderstanding that this was because of their being the disbelievers. Therefore, in these verses it has been made clear that its real cause is not their disbelief but their hostility to Islam and their tyrannical treatment of the followers of Islam. The Muslims, therefore, should distinguish between the hostile disbeliever and the non-hostile disbeliever, and should treat those disbelievers well who have never treated them with evil. Its best explanation is the incident that took place between Asma, daughter of Abu Bakr, and her disbelieving mother. A wife of Abu Bakr's was Qutaylah bint Abdul Uzza, who was a disbeliever and had remained behind in Makkah after the migration. Asma had been born of her. After the peace treaty of Hudaibiyah when the traffic opened between Makkah and Madinah, she came to Al-Madinah to see her daughter and also brought some gifts. Asma herself has related that she went to the Prophet (peace be upon him) and asked: Should I see my mother. And can I treat her as a daughter should treat her mother. The Prophet (peace be

upon him) replied: Yes, treat her as your mother. (Musnad Ahmad, Bukhari, Muslim). Asma's son, Abdullah bin Zubair, has given further details of this incident. He says that Asma in the beginning had refused to see her mother. Then, when she received Allah and His Messenger's permission she met her. (Musnad Ahmad, Ibn Jarir, Ibn Abi Hatim). This by itself leads to the conclusion that a Muslim's serving his unbelieving parents and his helping his unbelieving brothers and sisters and relatives is permissible when they are not hostile to Islam. Likewise, one can also spend his charities on the indigent among the dhimmis. (Al-Jassas, Ahkam al-Quran; Ruh al-Maani).

13* سابقہ آیات میں کفار سے جس ترک تعلق کی ہدایت کی گئی تھی اس کے متعلق لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہو سکتی تھی کہ یہ ان کے کافر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس لیے ان آیات میں یہ سمجھا یا گیا ہے کہ اس کی اصل وجہ ان کا کفر نہیں بلکہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ ان کی عداوت اور ان کی ظالمانہ روش ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق کرنا چاہیے، اور ان کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی ان کے ساتھ کوئی برائی نہ کی ہو۔ اس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اسماء بنت ابی بکر اور ان کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی قتیلہ بنت عبدالعزّٰی کافرہ تھیں اور ہجرت کے بعد مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماء انہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مدینہ اور مکہ کے درمیان آمد و رفت کا راستہ کھل گیا تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفہ تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کی اپنی روایت یہ ہے کہ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں ان سے صلہ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟ حضورؐ نے جواب دیا اس سے صلہ رحمی کرو (مسند احمد۔ بخاری۔ مسلم)۔ حضرت اسماء کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر اس واقعہ کی مزید تفصیل یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلے حضرت اسماء نے ماں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں جب اللہ اور

اس کے رسول کی اجازت مل گئی تب وہ ان سے ملیں (مسند احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں باپ کی خدمت کرنا اور اپنے کافر بھائی بہنوں اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے جبکہ وہ دشمن اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذمی مساکین پر صدقات بھی صرف کیے جا سکتے ہیں (احکام القرآن للجصاص۔ روح المعانی)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا	اے وہ لوگوں جو ایمان لائے جب	10. O those who believed, when
جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ	آئیں تمہارے پاس مومن عورتیں	come to you the
فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ	ہجرت کرکے تو انکی آزمائش کر لو۔	believing women
بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ	اللہ خوب جانتا ہے انکے ایمان کو۔	as emigrants,
مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى	سو اگر تمکو معلوم ہو جائے کہ وہ	examine them.
الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا	ایمان والی ہیں تو نہ واپس بھیجو انکو	Allah is best
هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۚ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ	کفار کے پاس *14۔ نہ یہ ہیں	Aware of their
اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ	حلال انکو اور نہ ہیں وہ حلال انکو۔	faiths. Then, if
تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ	اور دیدو انکو جو کچھ انہوں نے خرچ	you find them to
اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا	کیا ہو۔ اور نہیں کچھ گناہ تم پر کہ ان	be true believers,
بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَآ	سے نکاح کر لو جبکہ دیدو انہیں ان	then do not return
اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ	کے مہر *15۔ اور نہ روکے رکھو	them to the
ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ	زوجیت میں کافر عورتوں کو۔	disbelievers.*14
	اور مانگ لو جو کچھ خرچ کیا ہو تم نے	They are not
	اور وہ مانگ لیں جو کچھ خرچ کیا ہو	lawful for them
		nor are they lawful
		for them. And give
		to them that which
		they have spent.
		And there is no sin
		on you that you
		marry them when
		you have given

them their dues. *15And do not hold back in marriage the disbelieving women. And ask for what you have spent and let them ask for what they have spent. That is Allah's command. *16 He judges between you. And Allah is All Knowing, All Wise.	انہوں نے۔ یہ ہے حکم اللہ کا *16۔ وہ فیصلہ کئے دیتا ہے تمہارے درمیان۔ اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔	بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝١٠

*14 The background of this injunction is that after the peace treaty of Hudaibiyah, in the beginning, the Muslim men started fleeing Makkah, while arriving at Al-Madinah they were sent back according to the terms of the treaty. Then the Muslim women started arriving and first of all, Umm Kulthum Uqbah bin Abi Muait emigrated to Al-Madinah, The disbelievers invoked the treaty and demanded return, and two brothers of Umm Kulthum, Walid bin Uqbah and Amarah bin Uqbah, came to Al-Madinah to take her back. At this the question arose whether the treaty of Hudaibiyah applied to the women as well. Allah has answered this very question here, saying: If they are Muslims, and it is ascertained that they have emigrated only for the sake of the faith and for no other

motive, they are not to be returned.

Here, a complication has arisen on account of the narration of the Hadith from the viewpoint of the meaning and content, and it must be resolved. The traditions that are found in the Ahadith about the conditions of the treaty of Hudaibiyah are mostly traditions narrated from the viewpoint of the meaning and purport. About the condition under discussion the words in the different traditions are different. In some the words are to the effect: Whoever reaches us from you, we will not return him, but whoever reaches you from us, you shall return. In some others the words are to the effect: Whoever of his companions comes to the Messenger (peace be upon him) of Allah without the permission of his guardian, he will send him back. And in still another, the words are: Whoever, from the Quraish goes to Muhammad (peace be upon him) without the permission of his guardian, he will return him to Quraish. The style of these traditions by itself shows that this condition of the treaty has not been reported in the actual words of the treaty, but the reporters have reported its purport in their own words. But since most of the traditions are of the same nature, the commentators and traditionists generally have understood that the treaty was general, which applied to both men and women, and the women too were to be returned according to it. Later, when this injunction of the Quran that the believing women were not to be returned, came to their knowledge, they interpreted it to mean that Allah in this verse had decided to break the treaty in so far as it related to the believing women. But this

was not an ordinary thing which should be accepted so easily. If the treaty was general, without any exception in respect of men and women, it could not be lawful for one party to amend it unilaterally and change a part of it by itself. And even if such a thing happened, it is strange that the Quraish did not protest against it, whereas they remained on the lookout for an opportunity to raise objections against everything that the Prophet (peace be upon him) and the Muslims did. Had they found that the Prophet had committed a breach of the treaty conditions, they would have raised a loud clamor. But we do not find any trace of it in any tradition that they took an exception to this ruling of the Quran. Had this question been carefully considered the problem could have been resolved by reference to the actual words of the treaty. But many people paid no attention to it. If some scholars (e.g. Qadi Abu Bakr Ibn al-Arabi) did pay any attention, they did not hesitate to say that the reason why the Quraish did not raise any objection was that Allah had miraculously scaled their mouths in this matter. It is strange how these scholars felt satisfied at this explanation.

The fact of the matter is that this condition of the peace treaty had been proposed by the disbelieving Quraish, and not by the Muslims, and the words that Suhail bin Amr, their representative, had gotten included in the treaty were: And that whichever man (*rajul*) come to you from us, even if he be on your religion, you will return him to us. These words of the treaty have been reproduced in Bukhari (Kitab ash-Shurut: Bab ash-Shurut fil-Jihad wal-

Masalahah) through authentic channels. It may be that Suhail used the word *rajul* in the meaning of a person, but this might be the meaning he had in his mind. The word written in the treaty was *rajul*, which is used for a full-grown man in Arabic. That is why when the brothers of Umm Kulthum bint Uqbah came to the Prophet (peace be upon him) and demanded her return, (according to Imam Zuhri's tradition), Holy Prophet (peace be upon him) refused to return her, saying: The condition was about the men, not the women. (Ibn al-Arabi, Ahkam al-Quran; Loam Razi, Tafsir Kabir) Until then the people of Quraish themselves were under the delusion that the treaty applied to all kinds of emigrants, men or women; But when the Prophet (peace be upon him) drew their attention to these words of the treaty, they were struck dumb and had to accept this decision.

According to this condition of the treaty the Muslims had the right to decline return of any woman who emigrated from Makkah to Al-Madinah for any reason whatsoever. But Islam was interested only in safeguarding the believing women and not to make the holy city of Al-Madinah a place of refuge for every kind of female fugitive. Therefore, Allah enjoined: Ascertain by examination the faith of the women who emigrated to you and profess to have believed; and when it is fully ascertained that they have emigrated with genuine faith, and no other motive, do not return them. Thus, the procedure adopted for carrying out this command was that the women who emigrated were questioned whether they believed in the oneness of Allah

and the Prophethood of Muhammad (peace be upon him) and had emigrated only for the sake of Allah and His Messenger (peace be upon him), and not out of any worldly consideration, e.g. hatred of the husband, or love of somebody in Al-Madinah, or some other worldly motive. Only those women who gave satisfactory answers to these questions were allowed to stay, others were sent back. (Ibn Jarir on the authority of Iba Abbas, Qatadah, Mujahid, Ikrimah, Ibn Zaid).

In this verse a basic principle of the law of evidence has also been stated and its further clarification has been made by the procedure that the Prophet (peace be upon him) had prescribed for implementing it, The verse enjoins three things:

(1) Examine the faith of the emigrating women who present themselves as believers.

(2) Allah alone knows the truth about their faith; the Muslims have no means to find out whether they have really believed or not.

(3) When it has been ascertained that they are believers, they are not to be returned.

Then, in accordance with this injunction, the method that the Prophet (peace be upon him) prescribed for examining and ascertaining the faith of the women was that the statement given by them on oath should be relied on and it should be made sure after necessary examination that they had no other motive of emigration than the faith. First, it gives the principle that for taking decision on different matters it is not necessary for the court to have direct

knowledge of the truth; for the court only that knowledge is sufficient which is obtained through evidence. Second, the statement given by a person on oath will be regarded as reliable until it is proved to be false by a clear evidence. Third, whatever declaration a person himself may make about his creed and faith, will be accepted and no search will be made into finding out, whether what he states actually constitutes his faith or not, unless there is a clear indication to the contrary. And fourth, in the personal affairs of a person, which no one else can know, his own statement will be trusted. e.g. in the matters of divorce and the waiting period (*iddat*) the woman's own statement about her menstrual course and state of purity will be regarded as reliable, whether it is true or false. According to these very rules, in the science of the Hadith also, those traditions will be accepted, the apparent state of whose reporters testifies to their being righteous, unless, of course, there are other circumstances which forbid the acceptance of a particular tradition.

14*اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اول اول تو مسلمان مرد مکہ سے بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے رہے اور انہیں معاہدے کی شرائط کے مطابق واپس کیا جاتا رہا۔ پھر مسلمان عورتوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور سب سے پہلے ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ہجرت کر کے مدینے پہنچیں۔ کفار نے معاہدے کا حوالہ دے کر ان کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا اور ام کلثوم کے دو بھائی ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ انہیں واپس لے جانے کے لیے مدینے پہنچ گئے۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر وہ مسلمان ہوں اور یہ اطمینان کر لیا جائے کہ واقعی وہ ایمان ہی کی خاطر ہجرت کر کے آئی ہیں، کوئی اور چیز انہیں نہیں لائی ہے، تو انہیں واپس نہ کیا جائے۔

اس مقام پر احادیث کی روایت بالمعنیٰ سے ایک بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے جسے حل کرنا ضروری ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے متعلق احادیث میں جو روایتیں ہمیں ملتی ہیں وہ اکثر و بیشتر بالمعنیٰ روایات ہیں۔ زیر بحث شرط کے متعلق ان میں سے کسی روایت کے الفاظ یہ ہیں : من جاءمنکم لم نردہ علیک ومن جاء کم منا ردد تموہ علینا۔ ''تم میں سے جو شخص ہمارے پاس آئے گا اسے ہم واپس نہ کریں گے اور ہم میں سے جو تمہارے پاس جائے گا اسے تم واپس کرو گے''۔ کسی میں یہ الفاظ ہیں، من اتیٰ رسول اللہ من اصحابہ بغیر اذن ولیہ ردہ علیہ۔ ''رسول اللہ کے پاس ان کے اصحاب میں سے جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا اسے وہ واپس کر دیں گے''۔ اور کسی میں ہے من اتیٰ محمداً من قریش بغیر اذن ولیہ ردہ علیہم۔ ''قریش میں سے جو شخص محمدؐ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جائے گا اسے وہ قریش کو واپس کر دیں گے''۔ ان روایات کا طرز بیان خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ان میں معاہدے کی اس شرط کو ان الفاظ میں نقل نہیں کیا گیا ہے جو اصل معاہدے میں لکھے گئے تھے، بلکہ راویوں نے ان کا مفہوم خود اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن چونکہ بکثرت روایات اسی نوعیت کی ہیں اس لیے عام طور پر مفسرین و محدثین نے اس سے یہی سمجھا کہ معاہدہ عام تھا جس میں عورت مرد سب داخل تھے اور عورتوں کو بھی اس کی رو سے واپس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بعد جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا کہ مومن عورتیں واپس نہ جائیں تو ان حضرات نے اس کی یہ تاویل کی کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومن عورتوں کی حد تک معاہدہ توڑ دینے کا فیصلہ فرما دیا۔ مگر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جس کو اس آسانی کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ اگر معاہدہ فی الواقع بلا تخصیص مرد و زن سب کے لیے عام تھا تو آخر یہ کیسے جائز ہو سکتا تھا کہ ایک فریق اس میں یک طرفہ ترمیم کر دے یا اس کے کسی جز کو بطور خود بدل ڈالے؟ اور بالفرض ایسا کیا بھی گیا تھا تو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ قریش کے لوگوں نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قریش والے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی ایک ایک بات پر گرفت کرنے کے لیے خار کھائے بیٹھے تھے۔ انہیں اگر یہ بات ہاتھ آجاتی کہ آپ شرائط معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کر گزرے ہیں تو وہ زمین و آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ لیکن ہمیں کسی

روایت میں اس کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ انہوں نے قرآن کے اس فیصلے پر ذرہ برابر بھی چون وچرا کی ہو۔ یہ ایسا سوال تھا جس پر غور کیا جاتا تو معاہدے کے اصل الفاظ کی جستجو کر کے اس پیچیدگی کا حل تلاش کیا جاتا، مگر بہت سے لوگوں نے تو اس کی طرف توجہ نہ کی، اور بعض حضرات (مثلاً واسی ابوبکر ابن عربی) نے توجہ کی بھی تو انہوں نے قریش کے اعتراض نہ کرنے کی یہ توجیہ تک کرنے میں تامل نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس معاملہ میں قریش کی زبان بند کر دی تھی۔ تعجب ہے کہ اس توجیہ پر ان حضرات کا ذہن کیسے مطمئن ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ معاہدہ صلح کی یہ شرط مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ کفار قریش کی طرف سے تھی، اور ان کی جانب سے ان کے نمائندے سہیل بن عمرو نے جو الفاظ معاہدے میں لکھوائے تھے وہ یہ تھے: علیٰ ان لا یاتیک منا رجل و ان کان علی دینک الا رددتہ الینا۔ ''اور یہ کہ تمہارے پاس ہم میں سے کوئی مرد بھی آئے، اگرچہ وہ تمہارے دین ہی پر ہو، تم اسے ہماری طرف واپس کرو گے''۔ معاہدے کے یہ الفاظ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد و المصالحہ میں قوی سند کے ساتھ نقل ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سہیل نے رجل کا لفظ شخص کے معنی میں استعمال کیا ہو، لیکن یہ اس کی ذہنی مراد ہوگی۔ معاہدے میں جو لفظ لکھا گیا تھا وہ رجل ہی تھا جو عربی زبان میں مرد کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ام کلثوم بنت عقبہ کی واپسی کا مطالبہ لے کر ان کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو (امام زہری کی روایت کے مطابق) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمایا کہ کان الشرط فی الرجال دون النساء۔ ''شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں''۔ (احکام القرآن، ابن عربی۔ تفسیر کبیر، امام رازی)۔ اس وقت تک خود قریش کے لوگ بھی اس غلط فہمی میں تھے کہ معاہدے کا اطلاق ہر طرح کے مہاجرین پر ہوتا ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر جب حضور صلعم نے ان کو معاہدے کے ان الفاظ کی طرف توجہ دلائی تو وہ دم بخود رہ گئے اور انہیں ناچار اس فیصلے کو ماننا پڑا۔ معاہدے کے ان شرط کے لحاظ سے مسلمانوں کو حق تھا کہ جو عورت بھی مکہ چھوڑ کر مدینے آتی، خواہ وہ کسی

غرض سے آتی، اسے واپس دینے سے انکار کر دیتے۔ لیکن اسلام کو صرف مومن عورتوں کی حفاظت سے دلچسپی تھی، ہر طرح کی بھاگنے والی عورتوں کے لیے مدینہ طیبہ کو پناہ گاہ بنانا مقصود نہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں اور اپنے مومن ہونے کا اظہار کریں، ان سے پوچھ گچھ کر کے اطمینان کر لو کہ وہ واقعی ایمان لے کر آئی ہیں، اور جب اس کا اطمینان ہو جائے تو انکو واپس نہ کرو۔ چنانچہ اس ارشاد الٰہی پر عمل درآمد کرنے کے لیے جو قاعدہ بنایا گیا وہ یہ تھا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے آتی تھیں ان سے پوچھا جاتا تھا کہ کیا وہ اللہ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتی ہیں اور صرف اللہ اور اس کے رسول کی خاطر نکل کر آئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ شوہر سے بگڑ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی ہوں؟ یا ہمارے ہاں کے کسی مرد کی محبت ان کو لے آئی ہو؟ یا کوئی اور دنیوی غرض ان کے اس فعل کی محرک ہوئی ہو؟ ان سوالات کا اطمینان بخش جواب جو عورتیں دے دیتی تھیں صرف ان کو روک لیا جاتا تھا، باقی سب کو واپس کر دیا جاتا تھا (ابن جریر بحوالہ ابن عباس، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن زید)۔

اس آیت میں قانون شہادت کا بھی ایک اصولی ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی مزید توضیح اس طریق کار سے ہو گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل درآمد کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ہجرت کرنے والی جو عورتیں اپنے آپ کو مومن ہونے کی حیثیت سے پیش کریں ان کے ایمان کی جانچ کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کے ایمان کی حقیقت کو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تمہارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ایمان لائی ہیں۔ تیسرے یہ کہ جانچ پڑتال سے جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں واپس نہ کرو۔ پھر اس حکم کے مطابق ان عورتوں کے ایمان کی جانچ کرنے کے لیے جو طریقہ حضور نے مقرر فرمایا وہ یہ تھا کہ ان عورتوں کے حلفیہ بیان پر اعتماد کیا جائے اور ضروری جرح کر کے یہ اطمینان کر لیا جائے کہ ان کی ہجرت کا محرک ایمان کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس سے اول تو یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کو حقیقت کا علم حاصل ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ صرف وہ علم کافی ہے جو شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ہم ایک شخص کے حلفیہ بیان پر اعتماد کریں گے۔ تاوقتیکہ کوئی صریح قرینہ اس کے کاذب ہونے پر دلالت

نہ کر رہا ہو۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی اپنے عقیدے اور ایمان کے متعلق خود جو خبر دے رہا ہو ہم اسے قبول کریں گے اور اس بات کی کھوج میں نہ پڑیں گے کہ فی الواقع اس کا وہی عقیدہ ہے جو وہ بیان کر رہا ہے، الا یہ کہ کوئی صریح علامت ہمارے سامنے ایسی ظاہر ہو جائے جو اس کی تردید کر رہی ہو۔ اور چوتھی بات یہ کہ ایک شخص کے جن ذاتی حالات کو دوسرا کوئی نہیں جان سکتا ان میں اسی کے بیان پر بھروسہ کیا جائے گا، مثلاً طلاق اور عدت کے معاملات میں عورت کے حیض اور طہر کے متعلق اس کا اپنا بیان ہی معتبر ہوگا، خواہ وہ جھوٹ بولے یا سچ۔ انہی قواعد کے مطابق علم حدیث میں بھی ان روایات کو قبول کیا جائے گا جن کے راویوں کا ظاہر حال ان کے راستباز ہونے کی شہادت دے رہا ہو، الاّ یہ کہ کچھ دوسرے قرائن ایسے موجود ہوں جو کسی روایت کے قبول میں مانع ہوں۔

***15 This means that, a Muslim who wants to marry any of these women should pay a fresh dower and marry her. The dowers to he repaid to their unbelieving husbands will not be considered their dowers.**

*15 مطلب یہ ہے کہ ان کے کافر شوہروں کو ان کے جو مہر واپس کیے جائیں گے وہی ان عورتوں کے مہر شمار نہ ہوں گے، بلکہ جو مسلمان بھی ان میں سے کسی عورت سے نکاح کرنا چاہے وہ اس کا مہر ادا کرے اور اس سے نکاح کر لے۔

***16 Four very important injunctions have been laid down in these verses, which relate both to the family law of Islam and to the international law.**
First, that the woman who becomes a Muslim is no longer lawful for her unbelieving husband nor her unbelieving husband is lawful for her.
Second, that the marriage of the married woman who becomes a Muslim and emigrates from the abode of disbelief (*dar al-kufr*) to the abode of Islam (*dar al-Islam*) is automatically annulled, and any Muslim who likes can

marry her after paying her dower.

Third, that it is not lawful for a man who becomes a Muslim to retain his wife in wedlock if she likes to remain an infidel.

Fourth, that if there exist relations of peace between the abode of disbelief and the abode of Islam, the Islamic government should try to settle the question of the return of dowers with the non-Muslim government, thus: The dowers of the married women of the disbelievers, who become Muslims and emigrate to the abode of Islam, should be returned by the Muslims, and the dowers of the unbelieving married women of the Muslims who are left behind in the abode of disbelief, should be taken back from the disbelievers.

The historical background of these injunctions is as follows: In the beginning of Islam, there were many such men, who accepted Islam but their wives did not become Muslim, and there were many such women who became Muslim but their husbands did not accept Islam. Abul Aas, the husband of Zainab, a daughter of the Prophet (peace be upon him), was a non-Muslim and he remained non-Muslim for several years. In the early period no command had been given to the effect that the pagan husband was unlawful for the Muslim wife and the pagan wife was unlawful for the Muslim husband. Therefore, the marital relations continued to exist between them. Even after the migration for several years, it so happened that many women became Muslim and emigrated to Al-Madinah while their pagan husbands remained in the abode of disbelief. Likewise,

many Muslim men emigrated and their pagan wives were left in the abode of disbelief. But in spite of this their marriage continued. This was creating complications for the women in particular, for the men could marry other women, but this was not possible for the women. Until their marriage with their previous husbands was dissolved, they could not remarry. After the peace treaty of Hudaibiyah when these verses came down, they annulled the previous marriage between the Muslims and the pagans, and laid down an absolute and clear law for guidance in future. The jurists of Islam have codified this law under four major titles:

First, the case when both the man and the wife are in the abode of Islam and one of them becomes a Muslim and the other remains an infidel.

Second, the case when both the man and the wife are in the abode of disbelief, and one of them becomes a Muslim and the other remains an infidel.

Third, the case when one of the spouses becomes a Muslim and emigrates to the abode of Islam and the other remains an infidel in the abode of disbelief.

Fourth, the case when either of the Muslim spouses becomes an apostate.

Below we give the viewpoints of the jurists with regard to all the four cases separately:

(1) In the first case, if the husband has accepted Islam and his wife is a Christian or a Jewess, and she remains faithful to her religion, their marriage will endure, for it is permissible for a Muslim to have a wife who is a follower of

the earlier scriptures. This is agreed upon by all jurists. And if the wife of the man who has accepted Islam, is not a follower of the earlier Books, and she adheres to her faith, the Hanafis say that Islam will be presented before her; if she accepts it, the marriage will endure; if she refuses to accept it, separation will be effected between them. In this case, if consummation between them had taken place, the woman will be entitled to the dower; if there was no consummation, she will not be entitled to any dower, for separation has been caused because of her refusal. (Al-Mabsut; Hedayah; Fath al-Qadir). Imam Shafei and Imam Ahmad say that if the spouses did not have consummation, the woman would be outside wedlock as soon as the man accepted Islam, and if consummation had taken place; the woman will remain in wedlock till three menstruations. During this period if she accepts Islam of her own free will, the marriage will continue, otherwise it will become void automatically as soon as she is free from her third menstrual course. Imam Shafei also adds that it is not right to present Islam before the woman on the basis of the pledge of non-interference in religion that the dhimmis have been given by the Muslims. But this, in fact, is a weak argument; for it would be interference in the dhimmi woman's religion if she was compelled to accept Islam. It is no interference to tell her that if she accepted Islam, she would continue to be her husband's wife, otherwise she would be separated from him. In Ali's time there has been a precedent of this nature. An Iraqi landowner who was a Majusi by religion accepted Islam and his wife remained an

unbeliever, AIi presented Islam before her, and when she refused to accept it, he effected separation between them. (Al-Mabsut). Imam Malik says that if consummation has not taken place, the unbelieving wife would forthwith cease to be the wife as soon as the man embraced Islam, and if consummation has taken place, Islam would be presented before the woman, and in case she refuses to accept it, separation will result. (Ibn Qudamah, Al-Mughni).

And if Islam has been accepted by the woman and the man remains an infidel, whether he is a follower of an earlier scripture or a non-follower, the Hanafis say that Islam will be presented before the husband whether consummation between them has taken place or not. If he accepts it, the woman will continue to be his wife; if he rejects it, the qadi will effect separation between them. So long as the man does not refuse to accept Islam, the woman will remain his wife, but he will not have the right to have sexual relations with her. In case the husband refuses, separation will become effective just like an irrevocable divorce. If consummation has not taken place before this, the woman will be entitled to half the dower, and if it has taken place, the woman will be entitled to full dower as well as maintenance during the waiting period (*iddat*). (AI-Mabsut; Hedayah; Fath at-Qadir). According to Imam Shafei, marriage will dissolve as soon as the woman accepted Islam in case consummation has not taken place, and in case it has taken place, the woman will continue to be the man's wife till the end of the waiting period. If in the mean-time he accepts Islam, marriage will remain valid, otherwise

separation will take place as soon as the waiting period comes to an end. But in the case of the man, Imam Shafei has also expressed the same opinion as he has expressed about the woman as cited above. That is, it is not right to present Islam before him. But this is a weak opinion. In the time of Umar, on several occasions, the woman accepted Islam and the man was invited to Islam; when he refused to accept it, separation was effected between the spouses. There is, for examples the case of the wife of a Christian of the Bani Taghlib, which was brought before him. Umar said to the man: Accept Islam, otherwise I will effect separation between you two. He declined, and the Caliph enforced the decree. The case of a newly converted lady of Bahz al-Malik was sent to him. In her case too he ordered that Islam be presented before her husband; if he accepts it well and good, otherwise separation be effected between them. These incidents had happened in front of the companions and no dispute or difference of opinion has been reported. (AI-Jassas, Ahkam al-Quran; Al Mabsut; Fath al-Qadir). Imam Malik's opinion in this connection is that if the woman becomes a Muslim before the consummation of marriage Islam should be presented before the husband; if he accepts it, well and good; otherwise separation should be effected forthwith. And if consummation has taken place, and the woman has accepted Islam afterwards, she will have to wait till the end of the waiting period. If the husband accepts Islam in the meantime, marriage will continue otherwise separation will take place as soon as the waiting period expires. A saying of

Imam Ahmad is in support of Imam Shafei. His other saying is to the effect that the event of the difference of religion between the spouses will in any case lead to immediate separation, whether consummation between them has taken place or not. (Al-Mughni).

(2) If in dar al-kufr (abode of disbelief) the woman becomes a Muslim and the man remains an infidel, or the man becomes a Muslim and the wife (who neither is Christian nor Jew but is follower of a non-revealed religion) remains an infidel, the Hanafi viewpoint is that separation will not take place, whether consummation between them has taken place or not, until the woman completes three menstrual courses, or until she passes three months in case she is non-menstruating. If in the meantime the other spouse is also converted, marriage will remain valid, otherwise separation will take place on the expiry of the term. Imam Shafei, in this case also, distinguishes between the occurrence of consummation and its non-occurrence. He maintains that if there was no consummation, separation would occur immediately on the event of the difference of religion between the spouses. And if the difference of religion has occurred after the consummation, marriage will continue valid until the end of the waiting period. If in the meantime the other spouse does not accept Islam, marriage will dissolve as soon as the waiting period comes to an end. (Al Mabsut, Fath al-Qadir, Al-Jassas Ahkam al-Quran).

In case where along with the difference of religion between the spouses the separation of abode also takes place, i.e. one of them remains an infidel in daral-kufr (the non-Muslim

state) and the other emigrates to dar al-lslam (the Islamic state), the Hanafi viewpoint is that marriage between them will automatically dissolve. If the emigrant is the woman, she has the right to remarry immediately; she does not have to observe any waiting period. However, her husband will have to abstain from sexual intercourse until after she has discharged the menses once; and if she is pregnant, even then marriage can be contracted, but the husband must abstain from cohabitation until after the delivery. Imam Muhammad and Imam Abu Yusuf have differed from Imam Abu Hanifah in this. They say that the woman has to observe the waiting period; and if she is pregnant, she cannot contract marriage before the delivery. (Al-Mabsut; Hedayah; AI-Jassas, Ahkam al-Quran). Imam Shafei, Imam Ahmad and Imam Malik maintain that the separation of abode has nothing to do with this, for the real thing is only the difference of religions. If this difference takes place between the spouses, the injunctions to govern this are the same as those which govern it in case such a difference takes place between the spouses in the Islamic state (Al-Mughni). Imam Shafei along with his above cited opinion has also expressed the view that if the emigrant Muslim woman has emigrated after a quarrel with her infidel husband, with the intention of dissolving his marital right, an immediate separation will take place not on the basis of the separation of abode (*ikhtilaf dar*) but on the basis of her this intention. (Al-Mabsut Hedayah).

But a careful consideration of the Quranic verse under discussion clearly shows that in this matter the most sound

opinion is the one that Imam Abu Hanifah has expressed. Allah has sent down this verse concerning the believing women who emigrated and about them He has said that they are no longer lawful for the pagan husbands whom they have left behind in dar al-kufr, and has allowed the Muslims of the Islamic state to marry them after they have paid them the dowers. On the other hand, the emigrant Muslims have been addressed and enjoined not to keep those of their pagan wives in wedlock, who are left is dar al-kufr, and to ask of the disbelievers the dowers that they had given to those women. Obviously, these injunctions do not pertain only to the difference of religion, but it is the difference of abode that has given these injunctions this particular form. If on account of migration the marriages of the Muslim women with their pagan husbands had not become dissolved, how could the Muslims be permitted to marry them. And that too in a way that the permission does not contain any reference to the observance of the waiting period by them. Likewise, if even after the revelation of the command, “and you also should not hold back unbelieving women in marriage” the pagan wives of the Muslim emigrants had continued to be their wives, they also would have been commanded to divorce them. But there is no reference here to this either. No doubt, it is correct that after the revelation of this verse, Umar and Talhah and some other emigrants had divorced their wives, but this is no proof that such a thing was at all necessary, and their severing of the marital relationship with those wives depended on their pronouncing divorce on them, and if

they had not pronounced the divorce, the wives would have continued to be their legal wives.

In response to this, three events of the Prophet's (peace be upon him) time are quoted as precedents, which are regarded as a proof that even after the revelation these verses the prophet (peace be upon him), in spite of the separation of abode, allowed the marriage relationship to continue between the believing and the unbelieving spouses. The first event is this, a little before the conquest of Makkah, Abu Sufyan visited the Islamic army at Marr az-Zahran (present Wadi Fatimah) and accepted Islam, and his wife, Hind, remained a pagan in Makkah. Then Hind accepted Islam after the conquest of Makkah, and the Prophet (peace be upon him) ruled that their previous marriage would continue to be valid. The second event is that after the conquest of Makkah, Ikrimah bin Abu Jahl and Hakim bin Hizam fled Makkah and in their absence the wives of both became Muslims. Then they sought the Prophet's protection for their husbands and went and brought them back. Both the men come before the Prophet (peace be upon him) and accepted Islam and in their case too he held their previous marriages as valid. The third event relates to the Prophet's (peace be upon him) own daughter, Zainab, who emigrated to Al-Madinah and her husband, Abul-Aas, was left an infidel in Makkah. About him Musnad Ahmad, Abu Daud, Tirmidhi and Ibn Majah contain a tradition on the authority of Ibn Abbas, saying that he came to Al-Madinah in A.H. 8 and became a Muslim, and the Prophet (peace be upon him) allowed his

daughter to continue in marriage with him, without renewal of marriage. But the first two of these events, in fact, do not come under the definition of the difference of abode. For the difference of abode does not mean a person's temporarily leaving one place for another, or his fleeting to another place, but the difference takes place only in case a person emigrates from one place and settles down in another place and the difference of nationality takes place between him and his wife. As for the event relating to Zainab, there are two traditions, one related on the authority of Ibn Abbas, as referred to above, and the other related by Imam Ahmad, Tirmidhi and Ibn Majah on the authority of Abdullah bin Amr bin Aas. In this second tradition it has been stated that the Prophet (peace be upon him) allowed his daughter to continue as the wife of Abul-Aas after renewal of the marriage, and with a fresh dower. Thus, in the first place, this precedent, due to the difference in reporting, no longer remains a definite argument with those who deny the legal effect of the separation of abode. Secondly, if they insist on the authenticity of Ibn Abbas's tradition, it contradicts their own viewpoint. For, according to their viewpoint, the marriage of the spouses between whom difference of religion takes place and who have consummated their marriage remains valid only until three menstruations. In the meantime if the other party also accepts Islam, the marriage continues to be valid, otherwise it dissolves automatically as soon as the third menstrual course starts. But in the case of Zainab from which they take their argument, the difference of religion between the

spouses had taken place several years earlier. Abul Aas had affirmed the faith six years after Zainab's emigration, and at least two years before his conversion to Islam the injunction had been revealed in the Quran, according to which the Muslim woman had been forbidden for the pagans.

(4) The fourth case is of apostasy. Its one form is that both the husband and the wife should become apostates together, and the other that one of them becomes an apostate and the other remains a Muslim.

If both the husband and the wife become apostates together, the Shafeis and the Hanbalis say that their marriage contracted in Islam will dissolve immediately if this happened before consummation, and after the lapse of the waiting period if it happened after consummation. On the contrary, the Hanafis hold the view that although according to common sense their marriage should dissolve, yet in the time of Abu Bakr, when thousands of people became apostates, and then again became Muslims, the companions did not direct anyone to renew the marriage; therefore, we accept this unanimous decision of the companions and admit, contrary to common sense, that in case both the husband and the wife become apostates together, their marriages do not dissolve.(Al Mabsut; Hedayah; Fath al-Qadir Al-Fiqh alal-Madhahib al-Arbah).

If the husband becomes an apostate and the wife continues to be Muslim, according to the Hanafis and the Malikis, the marriage will dissolve immediately, whether this happens before consummation or after it. But the Shafeis and the

Hanbalis in this connection make a distinction between the two states. If it happens before consummation, the marriage will dissolved immediately, and if it happens after consummation it will endure till the end of the waiting period, In the meantime if the person returns to Islam, marriage will continue to hold good, otherwise, on the expiry of the waiting period, it will be deemed to have dissolved since he became an apostate. That is, the woman will not have to observe another waiting period afresh. All the four jurists agree that if this happened before consummation, the woman would be entitled to half the dower, and if after consummation to full dower.

And if the woman became an apostate, the old ruling of the Hanafis was that in this case too marriage would dissolve immediately. But later the scholars of Balkh and Samarkand gave the ruling that in case the woman becomes an apostate, separation does not take place immediately; and by this their object was to discourage the women from adopting this course in order to get rid of their husbands. The Malikis verdict is somewhat similar. They say that if circumstances testify that the woman adopted this course only as a pretence to win separation from the husband, separation will not take place. The Shafeis and the Hanbalis say that in case of the woman's turning an apostate too, the law is the same as in case of the husband's turning an apostate. That is, if she became an apostate before consummation, marriage would dissolve immediately and if after consummation, Marriage will endure till the end of the waiting period. If conversion takes

place in the meantime marriage will continue to hold good, otherwise it will be deemed to have dissolved since the time of apostasy. There is consensus with regard to the dower. If the woman became an apostate, before consummation she would not be entitled to any dower, and if she adopted apostasy after consummation, she would be entitled to full dower. (Al-Mabsut. Hedayah; Fath al-Qadlr, Al Mughni; Al-Fiqh alal-Madhahib al-Arbah).

16*ان آیات میں چار بڑے اہم حکم بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق اسلام کے عائلی قانون سے بھی ہے اور بین الاقوامی قانون سے بھی:

اول یہ کہ جو عورت مسلمان ہو جائے وہ اپنے کافر شوہر کے لیے حلال نہیں رہتی اور نہ کافر شوہر اس کے لیے حلال رہتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جو منکوحہ عورت مسلمان ہو کر دار الکفر سے دار الاسلام میں ہجرت کر کے آئے اس کا نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جاتا ہے اور جو مسلمان بھی چاہے اس کا مہر دے کر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو مرد مسلمان ہو جائے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی بیوی اگر کافر رہے تو وہ اسے اپنے نکاح میں روکے رکھے۔

چوتھے یہ کہ اگر دار الکفر اور دار الاسلام کے درمیان صلح کے تعلقات موجود ہوں تو اسلامی حکومت کو دار الکفر کی حکومت سے یہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کفار کی جو منکوحہ عورتیں مسلمان ہو کر دار الاسلام میں ہجرت کر آئی ہوں ان کے مہر مسلمانوں کی طرف سے واپس دے دیے جائیں، اور مسلمانوں کی منکوحہ کافر عورتیں جو دار الکفر میں رہ گئی ہوں ان کے مہر کفار کی طرف سے واپس مل جائیں۔

ان احکام کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ آغاز اسلام میں بکثرت مرد ایسے تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا مگر ان کی بیویاں مسلمان نہ ہوئیں۔ اور بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو مسلمان ہو گئیں مگر ان کے شوہروں نے اسلام

قبول نہ کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابو العاص غیر مسلم تھے اور کئی سال تک غیر مسلم رہے۔ ابتدائی دور میں ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ مسلمان عورت کے لیے اس کا کافر شوہر اور مسلمان مرد کے لیے اس کی مشرک بیوی حلال نہیں ہے۔ اس لیے ان کے درمیان ازدواجی رشتے برقرار رہے۔ ہجرت کے بعد بھی کئی سال تک یہ صورت حال رہی کہ بہت سی عورتیں مسلمان ہو کر ہجرت کر آئیں اور ان کے کافر شوہر دار الکفر میں رہے۔ اور بہت سے مسلمان مرد ہجرت کر کے آ گئے اور ان کی کافر بیویاں دار الکفر میں رہ گئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے درمیان رشتہ ازدواج قائم رہا۔ اس سے خاص طور پر عورتوں کے لیے بڑی پیچیدگی پیدا ہو رہی تھی، کیونکہ مرد تو دوسرے نکاح بھی کر سکتے تھے، مگر عورتوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جب تک سابق شوہروں سے ان کا نکاح فسخ نہ ہو جائے وہ کسی اور شخص سے نکاح کر سکیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب یہ آیات نازل ہوئیں تو انہوں نے مسلمانوں اور کفار و مشرکین کے درمیان سابقہ ازدواجی رشتوں کو ختم کر دیا اور آئندہ کے لیے ان کے بارے میں ایک قطعی اور واضح قانون بنا دیا۔ فقہائے اسلام نے اس قانون کو چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے :

ایک، وہ حالت جس میں زوجین دار الاسلام میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

دوسرے، وہ حالت جس میں زوجین دار الکفر میں ہوں اور ان میں سے ایک مسلمان ہو جائے اور دوسرا کافر رہے۔

تیسرے، وہ حالت جس میں زوجین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو کر دار الاسلام میں ہجرت کر کے آجائے اور دوسرا دار الکفر میں کافر رہے۔

چوتھے، وہ حالت جس میں مسلم زوجین میں سے کوئی ایک مرتد ہو جائے۔

ذیل میں ہم ان چاروں حالتوں کے متعلق فقہاء کے مسالک الگ الگ بیان کرتے ہیں :

پہلی صورت میں اگر اسلام شوہر نے قبول کیا ہو اور اس کی بیوی عیسائی یا یہودی ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے تو دونوں کے درمیان نکاح باقی رہے گا، کیونکہ مسلمان مرد کے لیے اہل کتاب بیوی جائز ہے۔ یہ امر تمام فقہاء

کے درمیان متفق علیہ ہے۔

اور اگر اسلام قبول کرنے والے مرد کی بیوی غیر اہل کتاب میں سے ہو اور وہ اپنے دین پر قائم رہے، تو حنفیہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا، قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، نہ قبول کرے تو ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔ اس صورت میں اگر زوجین کے درمیان خلوت ہوئی ہو تو عورت مہر کی مستحق ہوگی، اور خلوت نہ ہوئی ہو تو اس کو مہر پانے کا حق نہ ہوگا، کیونکہ فرقت اس کے انکار کی وجہ سے واقع ہوئی ہے (المبسوط، ہدایہ، فتح القدیر)۔ امام شافعی اور احمد کہتے ہیں کہ اگر زوجین کے درمیان خلوت نہ ہوئی ہو تو مرد کے اسلام قبول کرتے ہی عورت اس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی، اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت تین مرتبہ ایام ماہواری آنے تک اس کے نکاح میں رہے گی، اس دوران میں وہ خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ تیسری بار ایام سے فارغ ہوتے ہی آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا۔ امام شافعیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ذمیوں کو ان کے مذہب سے تعرض نہ کرنے کی جو ضمانت ہماری طرف سے دی گئی ہے اس کی بنا پر یہ درست نہیں ہے کہ عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ لیکن در حقیقت یہ ایک کمزور بات ہے، کیونکہ ایک ذمی عورت کے مذہب سے تعرض تو اس صورت میں ہوگا جبکہ اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سے صرف یہ کہنا کوئی بے جا تعرض نہیں ہے کہ تو اسلام قبول کر لے تو اپنے شوہر کے ساتھ رہ سکے گی ورنہ تجھے اس سے الگ کر دیا جائے گا۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں اس کی نظیر پیش بھی آچکی ہے۔ عراق کے ایک مجوسی زمیندار نے اسلام قبول کیا اور اس کی بیوی کافر رہی۔ حضرت علیؓ نے اس کے سامنے اسلام پیش فرمایا۔ اور جب اس نے انکار کیا تب آپ نے دونوں کے درمیان تفریق کرا دی (المبسوط)۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر خلوت نہ ہو چکی ہو تو مرد کے اسلام لاتے ہی اس کی کافر بیوی اس سے فوراً جدا ہو جائے گی اور اگر خلوت ہو چکی ہو تو عورت کے سامنے اسلام پیش کیا جائے گا اور اس کے انکار کی صورت میں جدائی واقع ہو جائے گی (المغنی لابن قدامہ)۔

اور اگر اسلام عورت نے قبول کیا ہو اور مرد کافر رہے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہو یا غیر اہل کتاب میں سے، تو حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں میں خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو، ہر صورت میں شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا

جائے گا، قبول کر لے تو عورت اس کے نکاح میں رہے گی، انکار کر دے تو قاضی دونوں میں تفریق کرا دے گا۔ اس دوران میں جب تک مرد اسلام سے انکار نہ کرے، عورت اس کی بیوی تو رہے گی مگر اس کو مقاربت کا حق نہ ہوگا۔ شوہر کے انکار کی صورت میں تفریق طلاق بائن کے حکم میں ہوگی۔ اگر اس سے پہلے خلوت نہ ہوئی ہو تو عورت نصف مہر پانے کی حق دار ہوگی، اور خلوت ہو چکی ہو تو عورت پورا مہر بھی پائے گی اور عدت کا نفقہ بھی (المبسوط۔ ہدایہ۔ فتح القدیر)۔ امام شافعیؒ کے نزدیک خلوت نہ ہونے کی صورت میں عورت کے اسلام قبول کرتے ہی نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت ہونے کی صورت میں عدت ختم ہونے تک عورت اس مرد کے نکاح میں رہے گی۔ اس مدت کے اندر وہ اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا ورنہ عدت گزرتے ہی جدائی واقع ہو جائے گی۔ لیکن مرد کے معاملہ میں بھی امام شافعیؒ نے وہی رائے ظاہر کی ہے جو عورت کے معاملہ میں اوپر منقول ہوئی کہ اس کے سامنے اسلام پیش کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ مسلک بہت کمزور ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ عورت نے اسلام قبول کر لیا اور مرد سے اسلام لانے کے لیے کہا گیا اور جب اس نے انکار کر دیا تو دونوں کے درمیان تفریق کرا دی گئی۔ مثلاً بنی تغلب کے ایک عیسائی کی بیوی کا معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے مرد سے کہا یا تو تو اسلام قبول کر لے ورنہ میں تم دونوں کے درمیان تفریق کر دوں گا۔ اس نے انکار کیا اور آپ نے تفریق کی ڈگری دے دی۔ بہزُ الملک کی ایک نو مسلم زمیندارنی کا مقدمہ ان کے پاس بھیجا گیا۔ اس کے معاملہ میں بھی انہوں نے حکم دیا کہ اس کے شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر وہ قبول کر لے تو بہتر، ورنہ دونوں میں تفریق کرا دی جائے۔ یہ واقعات صحابہ کرام کے سامنے پیش آئے تھے اور کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص۔ المبسوط۔ فتح القدیر) امام مالکؒ کے رائے اس معاملے میں یہ ہے کہ اگر خلوت سے پہلے عورت مسلمان ہو جائے تو شوہر کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، وہ قبول کر لے تو بہتر ورنہ فوراً تفریق کرا دی جائے۔ اور اگر خلوت ہو چکی ہو اور اس کے بعد عورت اسلام لائی ہو تو زمانہ عدت ختم ہونے تک انتظار کیا جائے، اس مدت میں شوہر اسلام قبول کر لے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ عدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام احمدؒ کا ایک قول امام شافعیؒ کی تائید میں ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ زوجین کے درمیان

اختلاف دین واقع ہو جانا بہر حال فوری تفریق کا موجب ہے خواہ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو (المغنی)۔

(2) دار الکفر میں اگر عورت مسلمان ہو جائے اور مرد کافر رہے، یا مرد مسلمان ہو جائے اور اس کی بیوی (جو عیسائی یا یہودی نہ ہو بلکہ کسی غیر کتابی مذہب کی ہو) اپنے مذہب پر قائم رہے، تو حنفیہ کے نزدیک خواہ ان کے درمیان خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، تفریق واقع نہ ہوگی جب تک عورت کو تین مرتبہ ایام ماہواری نہ آجائیں، یا اس کے غیر حائضہ ہونے کی صورت میں تین مہینے نہ گزر جائیں۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق بھی مسلمان ہو جائے تو نکاح باقی رہے گا، ورنہ یہ مدت گزرتے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام شافعیؒ اس معاملہ میں بھی خلوت اور عدم خلوت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اگر خلوت نہ ہوئی ہو تو زوجین کے درمیان دین کا اختلاف واقع ہوتے ہی فرقت ہو جائے گی، اگر خلوت ہو جانے کے بعد دین کا اختلاف رونما ہوا ہو تو عدت کی مدت ختم ہونے تک ان کا نکاح باقی رہے گا۔ اس دوران میں اگر دوسرا فریق اسلام قبول نہ کرے تو عدت ختم ہونے کے ساتھ ہی نکاح بھی ختم ہو جائے گا (المبسوط، فتح القدیر، احکام القرآن للجصاص)۔

(3)۔ جس صورت میں زوجین کے درمیان اختلاف دین کے ساتھ اختلاف دار بھی واقع ہو جائے، یعنی ان میں سے کوئی ایک دار الکفر میں کافر رہے اور دوسرا دار الاسلام کی طرف ہجرت کر جائے، اس کے متعلق حنفیہ کہتے ہیں کہ دونوں کے درمیان نکاح کا تعلق آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ اگر ہجرت کرنے والی عورت ہو تو اسے فوراً دوسرا نکاح کر لینے کا حق حاصل ہے، اس پر کوئی عدت نہیں ہے، البتہ مقاربت کے لیے اس کے شوہر کو استبرائے رحم کی خاطر ایک مرتبہ ایام ماہواری آجانے تک انتظار کرنا ہوگا، اور اگر وہ حاملہ ہو تب بھی نکاح ہو سکتا ہے مگر مقاربت کے لیے وضع حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ سے صرف اتنا اختلاف کیا ہے کہ ان کے نزدیک عورت پر عدت لازم ہے، اور اگر وہ حاملہ ہو تو وضع حمل سے پہلے اس کا نکاح نہیں ہو سکتا (المبسوط۔ ہدایہ۔ احکام القرآن للجصاص)۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اختلاف دار کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ اصل چیز صرف اختلاف دین ہے۔ یہ اختلاف اگر زوجین میں واقع ہو جائے تو احکام وہی ہیں جو دار الاسلام میں زوجین

کے درمیان یہ اختلاف واقع ہونے کے احکام ہیں (المغنی)۔ امام شافعیؒ اپنی مذکورہ بالا رائے کے ساتھ ساتھ ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورت کے معاملہ میں یہ رائے بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے کافر شوہر سے لڑ کر اس کے حق زوجیت کو ساقط کرنے کے ارادے سے آئی ہو تو اختلاف دار کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اس قصد کی بنا پر فوراً فرقت واقع ہو جائے گی (المبسوط وہدایہ)۔

لیکن قرآن مجید کی زیر بحث آیت پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں صحیح ترین رائے وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ نے ظاہر فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہجرت کر کے آنے والی مومن عورتوں ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے، اور انہی کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے ان کافر شوہروں کے لیے حلال نہیں رہیں جنہیں وہ دار الکفر میں چھوڑ آئی ہیں، اور دار الاسلام کے مسلمانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کر لیں۔ دوسری طرف مہاجر مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اپنی ان کافر بیویوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو جو دار الکفر میں رہ گئی ہیں اور کفار سے اپنے وہ مہر واپس مانگ لو جو تم نے ان عورتوں کو دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صرف اختلاف دین ہی کے احکام نہیں ہیں بلکہ ان احکام کو جس چیز نے یہ خاص شکل دے دی ہے وہ اختلاف دار ہے۔ اگر ہجرت کی بنا پر مسلمان عورتوں کے نکاح ان کے کافر شوہروں سے ٹوٹ نہ گئے ہوتے تو مسلمانوں کو ان سے نکاح کر لینے کی اجازت کیسے دی جا سکتی تھی، اور وہ بھی اس طرح کہ اس اجازت میں عدت کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ اسی طرح اگر لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ کا حکم آجانے کے بعد بھی مسلمان مہاجرین کی کافر بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ گئی ہوتیں تو ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا جاتا کہ انہیں طلاق دے دو۔ مگر یہاں اس کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت طلحہؓ اور بعض دوسرے مہاجرین نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔ مگر یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا، اور ان بیویوں کے ساتھ تعلق زوجیت کا انقطاع ان کے طلاق دینے پر موقوف تھا، اور اگر وہ طلاق نہ دیتے تو وہ بیویاں ان کے نکاح میں باقی رہ جاتیں۔

اس کے جواب میں عہد نبوی کے تین واقعات کی نظیریں پیش کی جاتی ہیں جن کو اس امر کا ثبوت قرار دیا جاتا

ہے کہ ان آیات کے نزول کے بعد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف دار کے باوجود مومن اور کافر زوجین کے درمیان نکاح کا تعلق برقرار رکھا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے ذرا پہلے ابوسفیان مرالظہران (موجودہ وادی فاطمہ) کے مقام پر لشکر اسلام میں آئے اور یہاں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور ان کی بیوی ہند مکہ میں کافر رہیں۔ پھر فتح مکہ کے بعد ہند نے اسلام قبول کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید نکاح کے بغیر ہی ان کو سابق نکاح پر برقرار رکھا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد عکرمہ بن ابی جہل اور حکیم بن حزام مکہ سے فرار ہو گئے اور ان کے پیچھے دونوں کی بیویاں مسلمان ہو گئیں۔ پھر انہوں نے حضورؐ سے اپنے شوہروں کے لیے امان لے لی اور جا کر ان کو لے آئیں۔ دونوں اصحاب نے حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی سابق نکاحوں کو برقرار رکھا۔ تیسرا واقعہ حضورؐ کی اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا ہے جو ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئیں تھیں اور ان کے شوہر ابوالعاص بحالت کفر مکہ ہی میں مقیم رہ گئے تھے۔ ان کے متعلق مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ وہ 8ھ میں مدینہ آ کر مسلمان ہوئے اور حضورؐ نے تجدید نکاح کے بغیر سابق نکاح ہی پر صاحبزادی کو ان کی زوجیت میں رہنے دیا۔ لیکن ان میں سے پہلے دو واقعے تو درحقیقت اختلاف دار کی تعریف ہی میں نہیں آتے، کیونکہ اختلاف دار اس چیز کا نام نہیں ہے ایک شخص عارضی طور پر ایک دار سے دوسرے دار کی طرف چلا گیا یا فرار ہو گیا، بلکہ یہ اختلاف صرف اس صورت میں واقع ہوتا ہے جب کوئی آدمی ایک دار سے منتقل ہو کر دوسرے دار میں آباد ہو جائے اور اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان موجودہ زمانے کی اصطلاح کے مطابق ''قومیت (Nationality)'' کا فرق واقع ہو جائے۔ رہا سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت ابن عباس کی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اور دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص کی ہے جس کو امام احمد، ترمذی، اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اس دوسری روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی کو جدید نکاح اور جدید مہر کے ساتھ پھر ابو العاص ہی کی زوجیت میں دے دیا۔ اس اختلاف روایت کی صورت میں اول تو یہ نظیر ان حضرات کے لیے

قطعی دلیل نہیں رہتی جو اختلاف دار کی قانونی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔ دوسرے، اگر وہ ابن عباس ہی کی روایت کے صحیح ہونے پر اصرار کریں تو یہ ان کے مسلک کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ ان کے مسلک کی رو سے تو جن میاں بیوی کے درمیان اختلاف دین واقع ہوگیا ہو اور وہ باہم خلوت کر چکے ہوں ان کا نکاح عورت کو صرف تین ایام ماہواری آنے تک باقی رہتا ہے، اس دوران میں دوسرا فریق اسلام قبول کر لے تو زوجیت قائم رہتی ہے، ورنہ تیسری بار ایام آتے ہی نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن حضرت زینب کے جس واقعہ سے وہ استدلال کرتے ہیں اس میں زوجین کے درمیان اختلاف دین واقع ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، حضرت زینب کی ہجرت کے چھ سال بعد ابو العاص ایمان لائے تھے، اور ان کے ایمان لانے سے کم از کم دو سال پہلے قرآن میں وہ حکم نازل ہو چکا تھا جس کی رو سے مسلمان عورت مشرکین پر حرام کر دی گئی تھی۔

(4)۔ چوتھا مسئلہ ارتداد کا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں، اور دوسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مرتد ہو اور دوسرا مسلمان رہے۔

اگر زوجین ایک ساتھ مرتد ہو جائیں تو شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ خلوت سے پہلے ایسا ہو تو فوراً، اور خلوت کے بعد ہو تو عدت کی مدت ختم ہوتے ہی دونوں کا وہ نکاح ختم ہو جائے گا جو حالت اسلام میں ہوا تھا۔ اس کے برعکس حنفیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کا نکاح فسخ ہو جائے، لیکن حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جو فتنہ ارتداد برپا ہوا تھا اس میں ہزارہا آدمی مرتد ہوئے، پھر مسلمان ہو گئے، اور صحابہ کرام نے کسی کو بھی تجدید نکاح کا حکم نہیں دیا، اس لیے ہم صحابہ کے متفقہ فیصلے کو قبول کرتے ہوئے خلاف قیاس یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ زوجین کے ایک ساتھ مرتد ہونے کی صورت میں ان کے نکاح نہیں ٹوٹتے (المبسوط، ہدایہ، فتح القدیر، الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

اگر شوہر مرتد ہو جائے اور عورت مسلمان رہے تو حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک فوراً نکاح ٹوٹ جائے گا، خواہ ان کے درمیان پہلے خلوت ہو چکی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ لیکن شافعیہ اور حنابلہ اس میں خلوت سے پہلے اور خلوت کے بعد کی حالت کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ اگر خلوت سے پہلے ایسا ہوا ہو تو فوراً نکاح ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہوا ہو تو زمانہ عدت تک باقی رہے گا، اس دوران میں وہ شخص مسلمان ہو جائے تو زوجیت برقرار رہے

گی، ورنہ عدت ختم ہوتے ہی اس کے ارتداد کے وقت سے نکاح فسخ شدہ شمار کیا جائے گا، یعنی عورت کو پھر کوئی نئی عدت گزارنی نہ ہوگی۔ چاروں فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ خلوت سے پہلے یہ معاملہ پیش آیا ہو تو عورت کو نصف مہر، اور خلوت کے بعد پیش آیا تو پورا مہر پانے کا حق ہو گا۔

اور اگر عورت مرتد ہو گئی ہو تو حنفیہ کا قدیم فتویٰ یہ تھا کہ اس صورت میں بھی نکاح فوراً فسخ ہو جائے گا، لیکن بعد کے دور میں علمائے بلخ و سمرقند نے یہ فتویٰ دیا کہ عورت کے مرتد ہونے سے فوراً فرقت واقع نہیں ہوتی، اور اس سے ان کا مقصد اس امر کی روک تھام کرنا تھا کہ شوہروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عورتیں کہیں ارتداد کا راستہ اختیار نہ کرنے لگیں۔ مالکیہ کا فتویٰ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرائن یہ بتا رہے ہوں کہ عورت نے محض شوہر سے علیحدگی حاصل کرنے کے لیے بطور حیلہ ارتداد اختیار کیا ہے تو فرقت واقع نہ ہو گی۔ شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ عورت کے ارتداد کی صورت میں بھی قانون وہی ہے جو مرد کے ارتداد کی صورت میں ہے، یعنی خلوت سے پہلے مرتد ہو تو فوراً نکاح فسخ ہو جائے گا، اور خلوت کے بعد ہو تو زمانہ عدت گزرنے تک نکاح باقی رہے گا، اس دوران میں وہ مسلمان ہو جائے تو زوجیت کا رشتہ برقرار رہے گا۔ ورنہ عدت گزرتے ہی نکاح وقت ارتداد سے فسخ شمار ہو گا۔ مہر کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ خلوت سے پہلے اگر عورت مرتد ہوئی ہے تو اسے کوئی مہر نہ ملے گا، اور اگر خلوت کے بعد اس نے ارتداد اختیار کیا ہو تو وہ پورا مہر پائے گی (المبسوط۔ ہدایہ۔ فتح القدیر۔ المغنی۔ الفقہ علی المذاہب الاربعہ)۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ	اور اگر جاتی رہے کوئی تمہاری بیویوں	11. And if has gone from you
اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ	میں سے کافروں کے پاس اور تمکو	any of your wives to the disbelievers,
فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ	غنیمت ہاتھ لگے تو دے دو انکو چلی	and then you obtain something
ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ	گئی ہیں جنکی بیویاں اتنا جو انہوں	then give those whose wives have
اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ	نے خرچ کیا تھا۔ *17 اور ڈرتے	gone the equivalent of what
	رہو اللہ سے وہ جس پر تم ایمان	

they have spent. *17 And fear Allah, He in whom you believe.	لائے ہو۔	اَنۡتُمۡ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱﴾

*17 This thing had two alternatives and the verse applies to both. First, with the disbelievers with whom the Muslims had treaty relations, they wanted to settle the matter, thus: We shall return the dowers of the women who have emigrated to us, and you will return the dowers of the pagan wives of our men who have been left on your side. But the disbelievers did not agree to this. However, according to Imam Zuhri, the Muslims, in obedience to the divine command became ready to return the dowers of the women who were left behind with the pagans in Makkah, but the pagans refused to return the dowers of the women who had emigrated to the Muslims in Al-Madinah. Thereupon Allah enjoined that the dowers of the emigrant women, which were to be returned to the pagans, should be collected together in Al-Madinah instead of sending these to pagans; then from these collections disbursements should be made to those to whom the dowers were due from the pagans according to what was due to them.

The second alternative was that there were several converts to Islam, who had emigrated to the abode of Islam from the territories of the disbelievers with whom the Muslims had no treaty relations, leaving their pagan wives behind. Likewise, some women had also become converts and emigrated, leaving their pagan husbands behind. About them it was decreed that the matter should be settled in the

abode of Islam itself on the bargain basis. That is, when the dowers were not being returned by the disbelievers, no dowers should be returned to them. Instead, the dower of the woman who had emigrated to the abode of Islam, should be paid to the person whose wife had been left with the disbelievers.

But in case the account could not be settled equitably thus, and the amount of the dower due on behalf of the disbelieving wives of Muslims, who were left in the abode of disbelief, exceeded the amount of the dowers of the Muslim women who had emigrated, it was enjoined that the deficiency be made up from the spoils that the Muslims took in the wars against the disbelievers. Ibn Abbas has related that the Prophet (peace be upon him) would command that the loss of the person who did not receive his share of the dower be made up from the spoils. (Ibn Jarir). This same view has been adopted by Ata, Mujahid, Zuhri, Masruq Ibrahim Nakhai, Qatadah, Muqatil and Dahhak. All these scholars say, that the people whose dowers are left with the disbelievers, should be paid these from the collective spoils taken from the enemy. That is, before the booty is distributed, the dead dowers of the people should be paid and then the distribution made in which these people too should be given their equal shares along with the other soldiers. Some jurists say that the loss of such people can be made up not only from the spoils but even from the *fai* properties. But a large section of the scholars does not subscribe to this view.

*17 اس معاملہ کی دو صورتیں تھیں اور اس آیت کا انطباق دونوں سورتوں پر ہوتا ہے: ایک صورت یہ تھی کہ

جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدانہ تعلقات تھے ان سے مسلمانوں نے یہ معاملہ طے کرنا چاہا کہ جو عورتیں ہجرت کر کے ہماری طرف آگئی ہیں ان کے مہر ہم واپس کر دیں گے، اور ہمارے آدمیوں کی جو کافر بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کے مہر تم واپس کر دو۔ لیکن انہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ امام زہری بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان ان عورتوں کے مہر واپس دینے کے لئے تیار ہو گئے جو مشرکین کے پاس مکہ میں رہ گئی تھیں، مگر مشرکوں نے ان عورتوں کے مہر واپس دینے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے پاس ہجرت کر کے آگئی تھیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مہاجر عورتوں کے جو مہر تمہیں مشرکین کو واپس کرنے ہیں وہ ان کو بھیجنے کے بجائے مدینے ہی میں جمع کر لیے جائیں اور جن لوگوں کو مشرکین سے اپنے دیے ہوئے مہر واپس لینے ہیں ان میں سے ہر ایک کو اتنی رقم دے دی جائے جو اسے کفار سے وصول ہونی چاہیے تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ جن کفار سے مسلمانوں کے معاہدانہ تعلقات نہ تھے ان کے علاقوں سے بھی متعدد آدمی اسلام قبول کر کے دار الاسلام میں آ گئے تھے اور ان کی کافر بیویاں وہاں رہ گئی تھیں۔ اسی طرح بعض عورتیں بھی مسلمان ہو کر ہجرت کر آئی تھیں اور ان کے کافر شوہر وہاں رہ گئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ دار الاسلام ہی میں اَدلے کا بدلہ چکا دیا جائے۔ جب کفار سے کوئی مہر واپس نہیں ملنا ہے تو انہیں بھی کوئی مہر واپس نہ کیا جائے۔ اس کے بجائے جو عورت ادھر آگئی ہے اس کے بدلے کا مہر اس شخص کو ادا کر دیا جائے جس کی بیوی ادھر رہ گئی ہے۔

لیکن اگر اس طرح حساب برابر نہ ہو سکے، اور جن مسلمانوں کی بیویاں ادھر رہ گئی ہیں ان کے وصول طلب مہر ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورتوں کے مہروں سے زیادہ ہوں، تو حکم دیا گیا کہ اس مال غنیمت سے باقی رقمیں ادا کر دی جائیں جو کفار سے لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ آگئے ہوں ابن عباسؓ کی روایت ہے جس شخص کے حصے کا مہر وصول طلب رہ جاتا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ اس کے نقصان کی تلافی مال غنیمت سے کر دی جائے (ابن جریر)۔ اسی مسلک کو عطاء، مجاہد، زہری، مسروق، ابراہیم نخعی، قتادہ، مقاتل اور ضحاک نے اختیار کیا ہے۔ یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ جن لوگوں کے مہر کفار کی طرف رہ گئے ہوں

ان کا بدلہ کفار سے ہاتھ آئے ہوئے مجموعی مال غنیمت میں سے ادا کیا جائے، یعنی تقسیم غنائم سے پہلے ان لوگوں کے فوت شدہ مہران کو دے دیے جائیں اور اس کے بعد تقسیم ہو جس میں وہ لوگ بھی دوسرے سب مجاہدین کے ساتھ برابر کا حصہ پائیں۔ بعض فقہاء یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف اموال غنیمت ہی نہیں، اموال فے میں سے بھی ایسے لوگوں کے نقصان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اہل علم کے ایک بڑے گروہ نے اس مسلک کو قبول نہیں کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ
الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا
يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا
يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا
يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ
بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ
اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا
يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ
فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اے نبی جب آئیں تمہارے پاس
مومن عورتیں بیعت کرنے کو تم
سے *18 اس بات پر کہ نہ تو شرک
کریں گی اللہ کے ساتھ کسی کو اور نہ
چوری کریں گی *19 اور نہ بدکاری
کریں گی اور نہ قتل کریں گی اپنی
اولاد کو *20 اور نہ لائیں گی کوئی
بہتان گھڑکر درمیان اپنے ہاتھوں
اور اپنے پیروں کے *21۔ اور نہ
نافرمانی کریں گی تیری نیک کاموں
میں *22 تو ان سے بیعت لے لو
*23 اور بخشش مانگو انکے لئے اللہ
سے۔ بیشک اللہ ہے بخشنے والا

12. O Prophet, when come to you the believing women pledging to you, *18 in that they will not associate with Allah anything, nor will they steal, *19 nor will they commit adultery, nor will they kill their children, *20 nor will they bring any slander forged between their own hands and their feet, *21 nor they will disobey you in what is right, *22 then accept their pledge *23 and ask

forgiveness for them from Allah. Surely, Allah is All Forgiving, All Merciful.	مہربان۔	

*18 As we have explained above, this verse was sent down some time before the conquest of Makkah. After the conquest the Quraish started coming to the Prophet (peace be upon him) in large numbers to take the oath of allegiance. From the men he took the oath himself on Mount Safa. As for the women he appointed Umar to administer the oath to them on his behalf and to ask them to pledge that they would refrain from the things mentioned in this verse. (Ibn Jarir, on the authority of Ibn Abbas; Ibn Abi Hatim, on the authority of Qatadah). Then, on his return to Al-Madinah he ordered the Muslim women of Al-Madinah to be gathered together in a house and he sent Umar to take the oath from them. (Ibn Jarir, Ibn Marduyah, Bazzar, Ibn Hibban, on the authority of Umm Atiyyah Ansariah). On the Eid day also, after his address to men, he went to the assembly of women and in his sermon to them, he recited this verse and asked them to pledge that they would refrain from the things mentioned in it. (Bukhari on the authority of Ibn Abbas's tradition). Apart from these occasions, at different other times also, the women came before the Prophet (peace be upon him) individually as well as collectively to take the oath of allegiance, as mentioned in several Ahadith.

*18 جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ آیت فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مکہ فتح

ہوا تو قریش کے لوگ جوق در جوق حضورؐ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ آپ نے مردوں سے کوہ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمرؓ کو اپنی طرف سے مامور فرمایا کہ وہ عورتوں سے بیعت لیں اور ان باتوں کا اقرار کرائیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں (ابن جریر بروایت ابن عباس۔ ابن ابی حاتم بروایت قتادہ)۔ پھر مدینہ واپس تشریف لے جا کر آپ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ کو ان سے بیعت لینے کے لیے بھیجا (ابن جریر، ابن مردویہ، بزار، ابن حبان، بروایت ام عطیہ انصاریہ)۔ عید کے روز بھی مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپ عورتوں کے مجمع کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبہ کے دوران میں آپ نے یہ آیت تلاوت کر کے ان باتوں کا عہد لیا جو اس آیت میں مذکور ہوئی ہیں (بخاری، بروایت ابن عباس)۔ ان مواقع کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں عورتیں فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتی رہیں جن کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے۔

***19 In Makkah, when the oath of allegiance was being administered, Hind bint Utbah, wife of Abu Sufyan, asked the Prophet (peace be upon him) its explanation and said: Messenger of Allah, Abu Sufyan is rather stingy. Will it be sinful if I take out something from his wealth without his permission to meet my own and my children's needs. The Prophet (peace be upon him) replied: Nay, but only, justly and lawfully; i.e. take only that much as may actually suffice for your needs. (Ibn al-Arabi, Ahkam al-Quran).**

*19 مکہ معظمہ میں جب عورتوں سے بیعت لی جا رہی تھی اس وقت حضرت ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے اس حکم کی تشریح دریافت کرتے ہوئے حضورؐ سے عرض کیا، یا رسول اللہ، ابو سفیان ذرا بخیل آدمی ہیں کیا میرے اوپر اس میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ان سے پوچھے بغیر ان کے مال میں سے کچھ لے لیا کروں؟ آپ نے فرمایا نہیں، مگر بس معروف کی حد تک۔ یعنی بس اتنا مال لے لو جو فی الواقع جائز ضروریات کے لیے کافی ہو (احکام القرآن، ابن عربی)۔

***20 This also includes abortion, whether it is abortion of**

the legitimate or of the illegitimate fetus.

*20اس میں اسقاط حمل بھی شامل ہے، خواہ وہ جائز حمل کا اسقاط ہو یا ناجائز حمل کا۔

*21 This implies two kinds of calumny:
(1) A woman's accusing other women of having illicit relations with other men and her spreading such stories among the people, for the women are generally prone to spreading such things.
(2) A woman's delivering a child by somebody else and making her husband believe that it is his. Abu Daud has related a tradition from Abu Hurairah saying that he heard the Prophet say: The woman who brings such a child into a family as does not actually belong to it, has no connection with Allah, and Allah will never admit her to Paradise.

*21اس سے دو قسم کے بہتان مراد ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کی تہمت لگائے اور اس طرح کے قصے لوگوں میں پھیلائے، کیونکہ عورتوں میں خاص طور پر ان باتوں کے چرچے کرنے کی بیماری پائی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک عورت بچہ تو کسی کا جنے اور شوہر کو یقین دلائے کہ تیرا ہی ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضور کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''جو عورت کسی خاندان میں کوئی ایسا بچہ گھسا لائے جو اس خاندان کا نہیں ہے اس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، اور اللہ اسے کبھی جنت میں داخل نہ کرے گا''۔

*22 In this brief sentence two important points of the law have been stated:
First, that obedience even to the Prophet (peace be upon him) has been restricted to "in what is good", although about the Prophet (peace be upon him) no one could imagine that he would order somebody to do an evil. From this it automatically follows that no one in the world can be

obeyed outside the bounds of divine law. For when obedience to Allah's Messenger himself is conditional upon "in what is good", who else can have a position to demand unconditional obedience and require the people to obey and follow each of his commands, laws, rules or customs, which are opposed to the law of Allah? The Prophet (peace be upon him) has stated this principle, thus: There is no obedience in the disobedience of Allah; obedience is only in what is good and right. (Muslim, Abu Daud, Nasai). Our great doctors have derived this very theme from this verse, Abdur Rehman bin Zaid bin Aslam says:

Allah has not said that they should not disobey you (the Prophet) but that they should not disobey you in what is good.

Then, when Allah Almighty has made obedience even to the Prophet himself conditional upon this, how can another person have the right that he should be obeyed in anything but what is good? (Ibn Jarir).

Imam Abu Bakr al-Jassas writes:

Allah knew that His Prophet (peace be upon him) never enjoined anything but what was good. Still He restricted obedience to him only in what is good, so that no one ever may find a provision to obey the kings when they enjoined something outside the obedience of Allah. The Prophet (peace be upon him) has said: He who obeys a creature in disobedience to the Creator, Allah appoints the same creature over him in power. (Ahkam al-Quran).

Allama Alusi says:

This command refutes the view of those ignorant people

who think that obedience to the ruler is absolutely necessary. Allah has restricted even obedience to His Messenger (peace be upon him) only in what is good, whereas the Messenger (peace be upon him) never enjoins anything but what is good. This is meant to warn the people that obedience to no one is lawful in disobedience to the Creator. (Ruh al-Maani).

Thus, this command in fact, is the foundation stone of the rule of law in Islam. The rule is that anything which is opposed to the law of Islam is a crime, and no one has the right to enjoin any such thing on any one. Anyone who enjoins anything against the law, is a culprit; and the one who obeys such a command is also a culprit. No subordinate can escape the punishment on the basis of the excuse that his superior officer had ordered him to do something which was a crime in the law.

The other thing which has great legal import is that in this verse after enjoining five prohibitions only one positive command has been given, namely that the Prophet (peace be upon him) will be obeyed in all good things. As for the evils, the major evils in which women of the pre-Islamic days were generally involved, have been mentioned and a pledge taken from them to refrain from them. But as for the good works, they have neither been mentioned nor any pledge taken to observe them. The only pledge that has been taken is that they will have to obey the Prophet (peace be upon him) in every good work that he enjoins. Now obviously, if the good works be only those which Allah Almighty has enjoined in the Quran, the pledge should

have been to the effect: You will not disobey Allah, or You will not disobey the injunctions of the Quran. But when the pledge taken was to the effect: You will not disobey any good work that is enjoined by the Messenger (peace be upon him) of Allah, it automatically leads to the conclusion that the Prophet (peace be upon him) has been given vast powers for the reformation of society, and it is obligatory to obey all his commands, whether they are found in the Quran or not.

On the basis of this very legal authority the Prophet (peace be upon him) asked the women to pledge that they would refrain from all those evils which were prevalent among the women of the Arabian society at that time, and gave several such commands as have not been mentioned in the Quran. One may study the following Ahadith in this connection:

Ibn Abbas, Umm Salamah, Umm Atiyyah Ansariah and others have reported that the Prophet (peace be upon him) while administering the oath of allegiance to the women asked them to pledge that they would refrain from mourning over the dead. These traditions have been related by Bukhari, Muslim, Nasai and Ibn Jarir.

A tradition reported by Ibn Abbas contains this detail: The Holy Prophet appointed Umar to administer the oath of allegiance to the women and commanded that he should forbid them to mourn over the dead, for in the days of pre-Islamic ignorance women used to tear their clothes and hair, scratched their faces and bewailed in aloud voice. (Ibn Jarir).

Zaid bin Aslam has reported that the Prophet (peace be

upon him), while administering the oath of allegiance forbade the women to scratch their faces, tear their garments, bewail and sing verses while mourning over the dead. (Ibn Jarir). Another tradition bearing on the same subject has been reported by Ibn Abi Hatim and Ibn Jarir from a woman who was among the women taking the oath of allegiance.

Qatadah and Hasan Basri say that one of the things that the Prophet (peace be upon him) had made the women to pledge also was that they would refain from talking with the other men freely. Ibn Abbas has explained it in a tradition, thus: That they would not talk with the other men in private. Qatadah has further explained it thus: Hearing this command Abdur Rahman bin Auf said: O Messenger (peace be upon him) of Allah, sometimes it so happens that we are not present in the house and somebody comes to see us. The Prophet replied: I do not mean this. That is, the woman is not forbidden to tell the visitor that the master of the house is not present. (These traditions have been cited by Ibn Jarir and Ibn Abi Hatim).

Abdullah bin Amr bin al-Aas has reported another tradition from Umaimah bint-Rugaiqah, maternal aunt of Fatimah, saying: The Prophet (peace be upon him) made me to pledge that I would neither bewail the dead nor display myself like the women of the pre-Islamic paganism. (Musnad Ahmad, Ibn Jarir).

Salmah bint Qais, a maternal aunt of the Prophet (peace be upon him), says: I went before the Prophet (peace be upon him) with some other women of the Ansar to take the oath

of allegiance. He made us to pledge that we would abstain from the things mentioned in this verse, and then said: Do not defraud your husbands. When we were about to leave, a woman said to me: Go and ask the Prophet (peace be upon him) what is meant by defrauding the husbands? When I went and asked the explanation, he replied: This that you should defraud him of his money and expend it on others. (Musnad Ahmad).

Umm Atiyyah says: The Prophet (peace be upon him) after administering to us the oath commanded us that we would attend the Eid congregational prayers, but the Friday prayer is not obligatory for us, and he forbade us to follow the bier. (Ibn Jarir).

The people who think that the constitutional powers and authority that the Prophet (peace be upon him) possessed emanated from his position as a ruler instead of his position as a Messenger (peace be upon him) of Allah, and say that since he was also the ruler at the time, whatever commands he gave in that capacity were only meant to be obeyed during his time, say an absurd thing. Consider the Prophet's (peace be upon him) commands and instructions that we have cited above. If these instructions given by him for the reformation of the woman had emanated only from his position as a ruler how could these reforms then be introduced and enforced among the women of the Muslim society of the entire world forever? Which ruler has there been in the world, who might have had the position that a command issued by him just once for a reform might have become enforced in the Muslim society everywhere in the

world forever? (For further explanation, see E.N. 15 of Surah Al-Hashr).

22*اس مختصر سے فقرے میں دو بڑے اہم قانونی نکات بیان کیے گئے ہیں :

پہلا نکتہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر بھی اطاعت فی المعروف کی قید لگائی گئی ہے، حالانکہ حضورؐ کے بارے میں اس امر کے کسی ادنیٰ شبہ کی گنجائش بھی نہ تھی کہ آپ کبھی منکر کا حکم بھی دے سکتے ہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو گئی کہ دنیا میں کسی مخلوق کی اطاعت قانون خداوندی کے حدود سے باہر جا کر نہیں کی جا سکتی، کیونکہ جب خدا کے رسول تک کی اطاعت معروف کی شرط سے مشروط ہے تو پھر کسی دوسرے کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ اسے غیر مشروط اطاعت کا حق پہنچے اور اس کے کسی ایسے حکم یا قانون یا ضابطے اور رسم کی پیروی کی جائے جو قانون خداوندی کے خلاف ہو۔ اس قاعدے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے : لاطاعت فی معصیت اللہ ، انما الطاعت فی المعروف۔ ''اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے، اطاعت صرف معروف میں ہے'' (مسلم، ابوداؤد، نسائی)۔ یہی مضمون اکابر اہل علم نے اس آیت سے مستنبط کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں :

'' اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہاری نافرمانی نہ کریں، بلکہ فرمایا یہ ہے کہ وہ معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی تک کی اطاعت کو اس شرط سے مشروط کیا ہے تو کسی اور شخص کے لیے یہ کیسے سزاوار ہو سکتا ہے کہ معروف کے سوا کسی معاملہ میں اس کی اطاعت کی جائے'' (ابن جریر)۔

امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ اس کا نبی کبھی معروف کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیتا، پھر بھی اس نے اپنے نبی کی نافرمانی سے منع کرتے ہوئے معروف کی شرط لگا دی تاکہ کوئی شخص کبھی اس امر کی گنجائش نہ نکال سکے کہ ایسی حالت میں بھی سلاطین کی اطاعت کی جائے جب کہ ان کا حکم اللہ کی اطاعت میں نہ ہو۔ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ : من اطاع مخلوقاً فی معصیت الخالق سلّط اللہ علیہ ذٰلک المخلوق، یعنی جو شخص خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ اس پر اسی مخلوق کو مسلط کر دیتا ہے ‘‘ (احکام القرآن)۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

’’یہ ارشاد ان جاہلوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اولی الامر کی اطاعت مطلقاً لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو رسول کی اطاعت پر بھی معروف کی قید لگا دی ہے، حالانکہ رسول کبھی معروف کے سوا کوئی حکم نہیں دیتا۔ اس سے مقصود لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ خالق کی معصیت میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے ‘‘ (روح المعانی)۔

پس در حقیقت یہ ارشاد اسلام میں قانون کی حکمرانی (Rule of Law) کا سنگ بنیاد ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ ہر کام جو اسلامی قانون کے خلاف ہو، جرم ہے اور کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ ایسے کسی کام کا کسی کو حکم دے۔ جو شخص بھی خلاف قانون حکم دیتا ہے وہ خود مجرم ہے اور جو شخص اس حکم کی تعمیل کرتا ہے وہ بھی مجرم ہے۔ کوئی ماتحت اس عذر کی بنا پر سزا سے نہیں بچ سکتا کہ اس کے افسر بالا نے اسے ایک ایسے فعل کا حکم دیا تھا جو قانون میں جرم ہے۔

دوسری بات جو آئینی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس آیت میں پانچ منفی احکام دینے کے بعد مثبت حکم صرف ایک ہی دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تمام نیک کاموں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کی جائے گی۔ جہاں تک برائیوں کا تعلق، وہ بڑی بڑی برائیاں گنا دی گئیں جن میں زمانہ جاہلیت کی عورتیں مبتلا تھیں اور ان سے باز رہنے کا عہد لے لیا گیا، مگر جہاں تک بھلائیوں کا تعلق ہے ان کی کوئی فہرست دے کر عہد نہیں لیا گیا کہ تم فلاں فلاں اعمال کرو گی بلکہ صرف وہی ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے تو عہد ان الفاظ میں لیا جانا چاہیے تھا کہ ’’تم اللہ کی نافرمانی نہ کرو گی‘‘ یا یہ کہ ’’تم قرآن کے احکام کی نافرمانی نہ کرو گی‘‘۔ لیکن جب عہد ان الفاظ میں لیا گیا کہ ’’جس نیک کام کا حکم بھی رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیں گے تم اس کی خلاف ورزی نہ کروگی'' تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی اصلاح کے لیے حضورؐ کو وسیع ترین اختیارات دیے گئے ہیں اور آپ کے تمام احکام واجب الاطاعت ہیں خواہ وہ قرآن میں موجود ہو یا نہ ہوں۔

اسی آئینی اختیار کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لیتے ہوئے ان بہت سی برائیوں کے چھوڑنے کا عہد لیا جو اس وقت عرب معاشرے کی عورتوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور متعدد ایسے احکام دیے جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اس کے لیے حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

ابن عباسؓ، ام سلمہؓ اور ام عطیہؓ انصاریہ وغیرہ کی روایات ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لیا کہ وہ مرنے والوں پر نوحہ نہ کریں گی۔ یہ روایات بخاری، مسلم، نسائی اور ابن جریر نے نقل کی ہیں۔

ابن عباسؓ کی ایک روایت میں تفصیل ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو عورتوں سے بیعت لینے کے لیے مامور کیا اور حکم دیا کہ ان کو نوحہ کرنے سے منع کریں، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں مرنے والوں پر نوحہ کرتے ہوئے کپڑے پھاڑتی تھیں، منہ نوچتی تھیں، بال کاٹتی تھیں اور سخت واویلا مچاتی تھیں (ابن جریر)۔ زید بن اسلم روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں کو اس سے منع کیا کہ وہ مرنے والوں پر نوحہ کرتے ہوئے اپنے منہ نوچیں اور گریبان پھاڑیں اور واویلا کریں اور شعر گا گا کر بین کریں (ابن جریر)۔ اسی کی ہم معنی ایک روایت ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ایک ایسی خاتون سے نقل کی ہے جو بیعت کرنے والیوں میں شامل تھیں۔

قتادہ اور حسن بصری رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ جو عہد حضورؐ نے بیعت لیتے وقت عورتوں سے کیے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ غیر محرم مردوں سے بات نہ کریں گی۔ ابن عباس کی روایت میں اس کی یہ وضاحت ہے کہ غیر مردوں سے تخلیہ میں بات نہ کریں گی۔ قتادہ نے مزید وضاحت یہ کی ہے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد سن کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا یا رسول اللہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم گھر پر نہیں ہوتے

اور ہمارے ہاں کوئی صاحب ملنے آجاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میری مراد یہ نہیں ہے۔ یعنی عورت کا کسی آنے والے سے اتنی بات کہہ دینا ممنوع نہیں ہے کہ صاحب خانہ گھر میں موجود نہیں ہیں (یہ روایات ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے نقل کی ہیں)۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خالہ امیمہؓ بنت رقیقہ سے حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے ان سے یہ عہد لیا کہ نوحہ نہ کرنا اور جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار کر کے اپنی نمائش نہ کرنا (مسند احمد، ابن جریر)۔

حضورؐ کی ایک خالہ سلمٰی بنت قیس کہتی ہیں کہ میں انصار کی چند عورتوں کے ساتھ بیعت کے لیے حاضر ہوئی تو آپ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا پھر فرمایا ولا تغششن ازواجکن ''اپنے شوہروں سے دھوکے بازی نہ کرنا'' جب ہم واپس ہونے لگیں تو ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ جاکر حضورؐ سے پوچھو شوہروں سے دھوکے بازی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ میں نے جاکر پوچھا تو آپؐ نے فرمایا تأخذ مالہ فتحابی غیرہ ''یہ کہ تو اس کا مال لے اور دوسروں پر لٹائے'' (مسند احمد)۔

ام عطیہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ نے بیعت لینے کے بعد ہمیں حکم دیا کہ ہم عیدین کی جماعت میں حاضر ہوا کریں گی البتہ جمعہ ہم پر فرض نہیں ہے، اور جنازوں کے ساتھ جانے سے ہمیں منع فرما دیا (ابن جریر)۔

جو لوگ حضور کے اس آئینی اختیار کو آپ کی حیثیت رسالت کے بجائے حیثیت امارت سے متعلق قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ چونکہ اپنے وقت کے حکمراں بھی تھے اس لیے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو احکام دیئے وہ صرف آپ کے زمانے تک ہی واجب الاطاعت تھے، وہ بڑی جہالت کی بات کہتے ہیں۔ اوپر کی سطور میں ہم نے حضورؐ کے جو احکام نقل کیے ہیں ان پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ ان میں عورتوں کی اصلاح کے لیے جو ہدایات آپ نے دی ہیں وہ اگر محض حاکم وقت ہونے کی حیثیت سے ہوتیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پوری دنیا کے مسلم معاشرے کی عورتوں میں یہ اصلاحات کیسے رائج ہو سکتی تھیں؟ آخر دنیا کا وہ کونسا حاکم ہے جس کو یہ مرتبہ حاصل ہو کہ ایک مرتبہ اس کی زبان سے ایک حکم صادر ہو اور روئے زمین پر

جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہاں کے مسلم معاشیرے میں ہمیشہ کے لیے وہ اصلاح رائج ہو جائے جس کا حکم اس نے دیا ہے؟ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورہ حشر، حاشیہ 15)۔

***23 Several authentic Ahadith show that in the Prophet's (peace be upon him) time the procedure of administering the oath of allegiance to the women was different from that to the men. For the men the procedure was that the ones pledging allegiance would give their hand in the hand of the Prophet (peace be upon him) and take the oath. As for the women; the Prophet (peace be upon him) never took any woman's hand in his own hand, but adopted other different methods. In this connection, the following traditions have been reported:**

Aishah says: By God, in connection with the oath of allegiance the Prophet's (peace be upon him) hand never touched any other woman's hand. While administering the oath of allegiance to a woman, he would only say to her: I have accepted your allegiance. (Bukhari, Ibn Jarir).

Umaimah bint Ruqaiqah has stated: I along with some other women went before the Prophet (peace be upon him) to pledge allegiance, and ho made us to pledge according to this verse of the Quran. When we said: We will not disobey you in what is good and right, he said: As far as it is in your power. We submitted: Allah and His Messenger (peace be upon him) are more kind to us than we could be to ourselves. Then we said: O Messenger of Allah, stretch your hand so that we may pledge allegiance. He replied: I do not shake hands with women: I only make them take the pledge. So he made us to pledge. In another tradition she has stated: The Prophet (peace be upon him) did not take

the hand of any of us in his own hand. (Musnad Ahmad, Tirmidhi, Nasai, Ibn Majah, Ibn Jarir, Ibn Abi Hatim).

Abu Daud in Marasi has related this from Shabi: While administering the oath of allegiance to the women, a sheet of cloth was stretched towards the Prophet (peace be upon him), which he took in his hand and said: I do not take the woman's hand in my hand. This same subject has been related by Ibn Abi Hatim from Shabi, by Abdur Razzaq from Ibrahim Nakhai and by Saeed bin Mansur from Qais bin Abi Hazim.

Ibn Ishaq, in Maghazi has related this from Aban bin Salih: The Prophet (peace be upon him) would put his hand in a vessel full of water and then the woman also would put her hand in the same vessel. In Bukhari, a tradition from Abdullah bin Abbas is to the effect: After giving the Eid congregational sermon, the Prophet (peace be upon him) went through the rows of the men to the place where the women were sitting. There, in his address, he recited this verse of the Quran, then asked the women: Do you promise to act according to it? A woman from the assembly replied: Yes, O Messenger of Allah.

In a tradition related by Ibn Hibban, Ibn Jarir, Bazzar and others, Umm Atiyyah Ansariah has stated this: The Prophet (peace be upon him) extended his hand from outside the house and we extended our hands from inside the house. But this does not prove that the women might have shaken hands with the Prophet (peace be upon him), for Umm Atiyyah has not made any mention of the shaking of hands. Probably on this occasion for the purpose of

taking the pledge the Prophet (peace be upon him) might have extended his hand from outside and the women their hands from inside the house towards him without any of their hands touching his.

23*معتبر اور متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ مردوں کی بیعت سے مختلف تھا۔ مردوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ بیعت کرنے والے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد کرتے تھے۔ لیکن عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے آپ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ مختلف دوسرے طریقے اختیار فرمائے۔ اس کے بارے میں جو روایات منقول ہوئی ہیں وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ’’ خدا کی قسم بیعت میں حضور کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ سے چھوا تک نہیں ہے۔ آپ عورت سے بیعت لیتے ہوئے بس زبان مبارک سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تجھ سے بیعت لی‘‘ (بخاری۔ ابن جریر)۔

امیہ بنت رقیقہ کا بیان ہے کہ میں اور چند عورتیں حضور کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئیں اور آپؐ نے قرآن کی اس آیت کے مطابق ہم سے عہد لیا۔ جب ہم نے کہا ’’ ہم معروف میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی‘‘ تو آپ نے فرمایا فیما استطعتنّ، ’’ جہاں تک تمہارے بس میں ہو اور تمہارے لیے ممکن ہو‘‘ ہم نے عرض کیا ’’اللہ اور اس کا رسول ہمارے لیے خود ہم سے بڑھ کر رحیم ہیں ‘‘ پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، بس میں تم سے عہد لوں گا۔ چنانچہ آپ نے عہد لے لیا۔ ایک اور روایت میں ان کا بیان ہے کہ آپؐ نے ہم میں سے کسی عورت سے بھی مصافحہ نہیں کیا (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ ابوداؤد نے مراسیل میں شعبی کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ایک چادر حضور کی طرف بڑھائی گئی آپ صلعم نے جس کو ہاتھ میں لے لیا اور فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ یہ مضمون

ابن ابی حاتم نے شعبی سے، عبدالرزاق نے ابراہیم نخعی سے اور سعید بن منصور نے قیس بن ابی حازم سے نقل کیا ہے۔

ابن اسحاق نے مغازی میں ابان بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ پانی کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال دیتے تھے، اور پھر اسی برتن میں عورت بھی اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھی۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ عید کا خطبہ دینے کے بعد آپ مردوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ نے وہاں اپنی تقریر میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی، پھر عورتوں سے پوچھا تم اس کا عہد کرتی ہو؟ مجمع میں سے ایک عورت نے جواب دیا ہاں یا رسول اللہ۔

ایک روایت میں جسے ابن حبان، ابن جریر اور بزار وغیرہ نے نقل کیا ہے، ام عطیہ انصاریہ کا یہ بیان ملتا ہے کہ ”حضورؐ نے گھر کے باہر سے ہاتھ بڑھایا اور ہم نے اندر سے ہاتھ بڑھائے“، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورتوں نے آپ سے مصافحہ بھی کیا ہو، کیونکہ حضرت ام عطیہ نے مصافحہ کی تصریح نہیں کی ہے۔ غالباً اس موقع پر صورت یہ رہی ہوگی کہ عہد لیتے وقت آپ نے باہر سے ہاتھ بڑھایا ہوگا اور اندر سے عورتوں نے اپنے اپنے ہاتھ آپ کے ہاتھ کی طرف بڑھا دیے ہوں گے بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ آپ کے ہاتھ سے مس ہو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَوَلَّوْا۟ قَوْمًا غَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا۟ مِنَ ٱلْءَاخِرَةِ كَمَا يَئِسَ ٱلْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْقُبُورِ ﴿١٣﴾	اے وہ لوگوں جو ایمان لائے نہ دوستی کرو ان لوگوں سے غصے ہوا ہے اللہ جن پر۔ وہ مایوس ہو گئے آخرت سے جس طرح کفار مایوس ہو گئے ان سے جو قبروں میں ہیں *24۔	13. O those who believed, take not as friends those people Allah became angry upon whom. They have despaired of the Hereafter just as the disbelievers have despaired of

those who are in the graves. *24

*24 The words in the original can have two meanings: First, that they have despaired of their well-being and rewards in the Hereafter just as the deniers of the life-after-death have despaired of the resurrection of their near and dear ones, who are dead and gone into the graves. This meaning has been given by Abdullah bin Abbas and Hasan Basri, Qatadah and Dahak.

The second meaning can be: They have despaired of the mercy and forgiveness of the Hereafter just as the disbelievers, who are lying in the graves, have despaired of every good, for they are certain of their being involved in the punishment. This meaning has been related from Abdullah bin Masud and from Mujahid, Ikrimah, Ibn Zaid, Kalbi, Muqatil, Mansur.

*24 اصل الفاظ ہیں قَدْ يَئِسُوْا من الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آخرت کی بھلائی اور اس کے ثواب سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح زندگی بعد موت سے انکار کرنے والے اس بات سے مایوس ہیں کہ ان کے جو عزیز رشتہ دار قبروں میں جا چکے ہیں وہ کبھی پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ یہ معنی حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور حضرات حسن بصری، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے بیان کیے ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ آخرت کی رحمت و مغفرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر ہر خیر سے مایوس ہیں، کیونکہ انہیں اپنے مبتلائے عذاب ہونے کا یقین ہو چکا ہے۔ یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرات مجاہد، عکرمہ، ابن زید، کلبی، مقاتل اور منصور رحمہم اللہ سے منقول ہیں۔